Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:2454-4035

انوار تحقیق

Volume sixth

July-December 2019

شمارہ ۷ تا ۱۲

قیمت ۵۰روپے

Editor

سید الیاس احمد مدنی

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad,
Telangana 500008 -

Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:2454-4035

ANWAR-E-TAHQEEQ

Volume: Sixth

July- December 2019

Issue: 7-12

Price : Rs. 50/-

Editor

Syed Iliyas Ahmed Madni

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad,
Telangana 500008 -

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۶ شمارہ۔۷ تا ۱۲ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰ روپئے سالانہ:۔۵۰۰ روپئے

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

نگراں:۔**پروفیسر عزیز بانو**، صدر شعبہ فارسی، مانو، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔500 008

موبائل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر صولت علی خان۔ڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری لکھنؤ

ارمان احمد

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

ڈاکٹر ای اے حیدری۔صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ لوہیا کالج چورو

متھی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

عباس حیدر نقوی، ریسرچ اسکالر، اے ایم یو، علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید۔صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

احمد علی، کیپر مینسکر پٹ۔سلار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	ضیاءِ تصوف			۳
۲۔	اردو کے فروغ میں ریاست ٹونک کے غیر مسلم شعراء کی خدمات	(اردو)	محمد باقر حسین	۴
۳۔	پروفیسر پریم شنکر سری واستو بحیثیت طنز و مزاح نگار	(اردو)	پروفیسر عزیز اللہ شیرانی	۱۰
۴۔	منشی دیبی پرشاد بشاشؔ اور ان کے سنسکرت/اردو تراجم	(اردو)	ڈاکٹر شاہد احمد جمالی	۱۷
۵۔	للتا پرشاد شادؔ حیات اور خدمات: راجستھان	(اردو)	ڈاکٹر نادرہ خاتون	۲۲
۶۔	آزادی کے بعد راجستھان کے اردو شعرا کا اجمالی تعارف	(اردو)	ڈاکٹر ای اے حیدری	۲۶
۷۔	راجستھان میں اردو ادب کی غالب آواز: دیوان جانی بہاری لال راضیؔ		عابد حسین حیدری	۳۵
۸۔	شانتا بالی۔ بحیثیت افسانہ نگار	(اردو)	ڈاکٹر اسما مسعود	۴۳
۹۔	فارسی اور انسان دوستی کی روایات	(اردو)	پروفیسر عبدالودود اظہر	۴۸

ضیاءِ تصوف

ایک مرتبہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی ابن کعب سے دریافت کیا کہ قرآن حکیم میں سب سے عظیم کون سی آیت ہے حضرت کعب نے جواب دیا آیت الکرسی ۔آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوالمنذر تمھیں یہ علم مبارک ہو

روایت ہے کہ جب آیت الکرسی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو اس کے ساتھ ستّر ہزار فرشتے بھی نازل ہوئے اور یہ اہتمام اس آیت کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے تھا۔ایک بار آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ آیت الکرسی مجھے عرش کے خزانوں میں سے عطا کی گئی ہے اور یہ ایسی نعمت ہے کہ مجھ سے پہلے کبھی کسی نبی کو عطا نہیں کی گئی

(کنزالاعمال)

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آیت الکرسی پڑھ کر اگر اولاد یا مال پر دم کر دیا جائے تو شیطانی وسوسوں اور فتنوں سے مال واولاد کی حفاظت رہتی ہے اور کوئی بھی شیطانی چال انسان کو نقصان نہیں پہنچاتی۔

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جس شخص نے رات کو سوتے وقت آیت الکرسی ایک بار بھی اگر پڑھ لی تو صبح تک ایک فرشتہ خاص طور پر اس کی حفاظت کرتا ہے اور شیطان پڑھنے والے کے پاس نہیں آپاتا،اور نہ صرف یہ کہ پڑھنے والا شیطانی سازشوں اور آفتوں سے محفوظ رہتا ہے بلکہ اس کا گھر،گھر والے اور گھر کا تمام ساز وسامان بھی ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے

(خیر متین)

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آیت الکرسی کے ۱۷۰ حروف ہیں اور اس آیت میں پانچ کلمے ہیں اور دس جملے ہیں۔جو شخص صبح کو پانچ مرتبہ آیت الکرسی پڑھ لیتا ہے وہ شام تک اس خدا کی امان میں رہتا ہے جس کی پناہ سے بڑھ کر کوئی پناہ نہیں۔۔۔اور جو شخص آبادی سے دور جا کر آیت الکرسی کو ۳۱۳ مرتبہ پڑھ کر کوئی دعا کرے تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی دعا کو قبول کر لیتے ہیں۔

اردو کے فروغ میں ریاست ٹونک کے غیر مسلم شعراء کی خدمات

محمد باقر حسین

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج ٹونک

صوبہ راجستھان میں ریاست ٹونک ایک مسلم ریاست تھی، یہاں شریعت کا قانون نافذ تھا۔اس کے باوجود یہاں کے فرماں رواسکولر ذہن رکھتے تھے۔اس ریاست میں مختلف ادیان و مذاہب،عقائدونظریات کے ماننے والی اقوام اتحادواتفاق کے ساتھ رہتی تھیں۔ان جملہ اقوام میں اہل کمال اوراہل ادب وسخن بھی شامل ہیں۔ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں سے نواب اسمٰعیل علی خاں تک سبھی فرماں رواؤں نے علم وادب کی ترقی وترویج کے لیے اہل فن وصاحب کمال ہستیوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ انہیں انعام واکرام سے بھی نوازا۔

راجستھان میں ریاست ٹونک کے حوالے سے اردوشعروادب کی نشونما میں غیر مسلم شعراء کا جائزہ لیا جایے تو ظاہر ہوگا کہ نواب امیر خاں کے دربار سے وابستہ بساون لال شاداںؔ ریاست ٹونک کے پہلے غیر مسلم شاعر تھے جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔شاداںؔ سخن گو کے ساتھ ساتھ تاریخ نگار بھی تھے۔آپ نے ریاست ٹونک کی تاریخ 'امیر نامہ' فارسی زبان میں ۱۹۲۵ء میں لکھی۔'امیر نامہ' ریاست ٹونک کی ابتدائی تاریخ کا مستند دستاویز ہے۔اسی طرح امیر خاں کے ساتھیوں میں مشہور شاعر و ادیب فقیر محمد خاں گویاںؔ بھی شامل تھے جنھوں نے 'بوستانِ حکمت' کا ترجمہ کیا۔جوشؔ ملیح آبادی انھی فقیر محمد خاں گویاںؔ کے پوتے تھے۔اس بات سے ٹونک کی مشترکہ تہذیب وادبی فضا کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نواب امیر خاں کے بعد فرماں روا نواب وزیرالدولہ مسند نشین ہوئے۔آپ کی تعلیم وتربیت لال قلعہ دہلی میں ہوئی۔غالبؔ اور مومنؔ سے آپ کا دوستانہ تعلقات تھے۔آپ کے عہدِ حکومت میں ۱۸۵۷ء کا خوں ریز ہنگامہ برپا ہوا۔لکھنؤ اور دہلی سے زبان وادب کے ماہرین نے ہجرت کر کے راجستھان کے جن علاقوں میں پناہ لی ان میں سے ایک ٹونک بھی تھا۔نواب وزیرالدولہ کے زمانہ میں تخلیق وتالیف کا کام انجام دیا گیا۔اس دور میں غیر مسلم ادباء میں منشی مصری لال، منشی چنی لال اور منشی تولارام نے کتابیں لکھیں۔

نواب وزیرالدولہ کے بعد نواب محمد علی خاں صاحبِ مسند ہویے۔آپ کا دورِ حکومت بہت مختصر تھا۔آپ ہی کے عہد میں ریاست ٹونک میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔غیر مسلم ادیب کنج بہاری طربؔ نے 'تاریخِ طرزِ نو' مرتب کی۔نواب محمد علی خاں کی

جلاوطنی کے بعد نواب ابراہیم علی خاں فرماں روائے ریاست ٹونک بنائے گیے۔نواب صاحب کو شعروسخن کا ذوق از حد تھا۔آپ سخن سنج، سخن فہم اور سخنور تھے اور شاعری میں خلیلؔ تخلص کرتے تھے۔آپ کے دورِحکومت میں ظہیرؔ دہلوی ٹونک بلوائیے گئے۔ظہیرؔ کا شمار استاد ذوقؔ کے تلامذہ میں ہوتا تھا لیکن وہ طرزِ مومنؔ میں بھی شاعری کرتے تھے۔ظہیرؔ کے ٹونک میں اقامت اختیار کرنے سے مقامی شعراء کے کلام میں دہلوی رنگ نظر آنے لگا۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی شعراء مستفید ہوئے۔نواب ابراہیم علی خاں خلیلؔ کی عہد حکومت میں اردو زبان وادب اور بزم شعروسخن کی محفلیں اپنے شباب پر تھیں۔ان محفلوں میں مسلم وغیر مسلم شعراء اپنا کلام پیش کرتے تھے۔غیر مسلم شعراء وادباء کے لیے یہ دور عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو زبان میں ریاست ٹونک کا پہلا تذکرہ 'بزمِ خلیل' ۱۸۹۶ء میں لکھا گیا۔مؤلف حکیم سید محمد اصغر علی آبروؔ نے 'بزمِ خلیل' میں ایک طرحی مشاعرہ کی روداد درج کی ہے۔اس مشاعرے کے بزم آرا نواب ابراہیم علی خاں خلیلؔ تھے اور مصرعہ طرح تھا:

''نہیں منظورِ لب یار کو صحبت میری''

اس تذکرہ میں ۸۵ شعراء کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام درج ہیں ان میں تین غیر مسلم شعراء منشی چھمی سہائے سوزؔ، لالہ امراؤ لال طپشؔ اور منشی جگن ناتھ پرشاد شادؔ بھی شامل ہیں۔ یہ تذکرہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ریاست ٹونک میں غیر مسلم شعراء نہ صرف شعری نشستوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔والیانِ ریاست ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں اعجاز و اکرام سے بھی نوازتے تھے۔

ریاست ٹونک میں غیر مسلم شعراء وادباء کے حوالے سے نتھن لال بہجتؔ اور انکے فرزند دیبی پرشاد بشاشؔ سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ ان دونوں نے اپنی زندگی کا کچھ عرصہ ریاست ٹونک میں بسر کیا تھا۔بشاشؔ شاعر کے علاوہ تذکرہ نگار بھی تھے انہوں نے ۱۸۸۵ء میں 'تذکرہ آثارِ شعرائے ہنود' مرتب کیا۔اس تذکرے میں ریاست ٹونک کے شعراء بساون لال شاداںؔ، چھمی نارائن آذرؔ، جیون رام شوقؔ اور برج موہن عاشقؔ کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام درج ہیں۔اس کے قطع نظر عہد ابراہیم میں برہم چاری پرمانند زاہدؔ، پنڈت رام کرن جوشیؔ اور منشی بالا سہائے متصدیؔ وغیرہ غیر مسلم شعراء موجود تھے۔'پرچہ درشاں محمد مصطفیٰ' اور 'جلسہ مولود شریف' متصدیؔ کی نعتیہ تخلیق ہیں۔ان شعراء نے غزل، نعت، قصیدہ، حکایت، مثنوی نیز جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کی شاعری کے موضوعات یادِ محبوب، کیفیتِ انتظار، اضطرابِ ہجر اور عشق کے مختلف پہلو ہیں۔اس طرح عہد ابراہیم میں مسلم شعراء کے شانہ بہ شانہ غیر مسلم شعراء نے بھی ریاست ٹونک میں اردو زبان اور شعروادب کی آبیاری میں فعال کردار ادا کیا ہے۔

نواب ابراہیم علی خاں کے بعد نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے۔آپ بھی صاحب قلم رئیس تھے۔سخن سرائی میں سعیدؔ تخلص کرتے تھے۔اس دور میں ہندوستان میں تحریکِ آزادی اور مارکسی نظریہ کی لہر چل رہی تھی۔ان رجحانوں کا اثر ٹونک کے

شعراء پر بھی ہوا۔ اس سبب شاعروں نے وطن پرستی اور اشتراکیت کے جزبے کو عوام میں متحرک کرنے کے لیے اپنے کلام میں اصلاحی اور قومی مضامین ادا کیے۔ اس عہد کے ہنود شعراء میں منوہر سہائے انورؔ اور رام نواس ندیمؔ کا نام پیش پیش ہیں۔ یہ شعراء آزادی کے بعد بھی شعر و ادب کی نشونما میں اپنا فعال کردار ادا کرتے رہے۔

ہندوستان کی آزادی سے کچھ ماہ قبل نواب سعادت علی خاں انتقال کر گیے۔ ان کے بعد نواب فاروق علی خاں ریاست کے حاکم بنے۔ آپ ہی کے دور حکومت میں ٹونک ریاست آزاد ہندوستان میں ملحق ہو گئی۔ دو ملکوں کی عوام کے درمیان ہجرت کا دور چلا۔ ایسے میں شاعر اتم چند چندنؔ نے بھی پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی اور ریاست ٹونک کی پرسکون اور ادبی فضا میں بود و باش اختیار کی۔ چندنؔ ٹونک کے غیر مسلم شعراء میں پہلے ایسے شاعر ہیں جن کے تین مجموعۂ کلام ہیں اور تینوں ہی شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں ٹونک میں شعراء و ادباء کی ایک نسل ایسی بھی ہے جو آزادی سے قبل اردو کے فروغ میں فعال تھی اور آزادی کے بعد بھی فعال رہی۔ اس نسل کے ہنود شعراء میں شیام بہاری شیامؔ اور گردھر داس بوہرہ قمرؔ کا ذکر ناگزیر ہے۔

ریاست ٹونک میں اردو شعر و ادب کی ترویج و ترقی میں مذکورہ بالا غیر مسلم شعراء اہمیت کے حامل ہیں باوجود اس کے یہ مضمون سب کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے طوالت کے مدنظر چند منتخب غیر مسلم شعراء کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بساون لال شاداںؔ: نام بساون لال تخلص شاداںؔ تھا۔ نواب امیر خاں کے دربار سے وابستہ تھے۔ آپ کو ٹونک کے پہلے غیر مسلم شاعر اور تاریخ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ریاست ٹونک کی ابتدائی تاریخ 'امیر نامہ' فارسی زبان میں لکھی۔ آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فی البدیہہ شعر کہتے تھے، جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اردو میں مثنوی 'کھٹمل نامہ'، ایک رباعی اور چند اشعار ملتے ہیں۔ مثنوی 'کھٹمل نامہ' نایاب ہے۔ 'تذکرہ آثارِ شعرائے ہنود' میں ایک رباعی درج ہے جو اس طرح ہیں:

گلِ گلاب نے خوبی عجب دکھائی ہے
بہارِ جامۂ گلگوں پہن کے آئی ہے
جو پوچھو سچ تو یہ ہے برکتِ قدومِ حضور
وگرنہ گل نے یہ خوبی کہاں سے پائی ہے

منشی لچھمی نارائن آذرؔ: نام منشی لچھمی نارائن تخلص آذرؔ تھا۔ شاعری کا شوق تھا، مولانا حکیم سعید احمد اسدؔ کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے کبھی کبھی دیبی پرشاد بشاشؔ سے بھی اصلاح سخن لیتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں مثنوی 'گلزار نصیحت'، 'بھگوت گیتا منظوم' اور 'گلدستہ بجن' اور ایک دیوان شامل ہیں۔ آپ ایک باکمال شاعر تھے۔ کلام میں سلاست، روانی، سادگی اور بندش کی چستی پائی جاتی

ہے۔آذؔر کی شاعری میں طرز مومنؔ کی جھلک نظر آتی ہے۔

غیروں پہ کھل نا جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا مومنؔ

اسی طرز میں آذؔر کا کلام ملاحظہ فرمائیے:

بھری محفل میں میرے سامنے فتنے اٹھاتے ہیں
وہ ملنے کے بہانے سب کو چھاتی سے لگاتے ہیں آذؔر

حکیم جگن ناتھ پرشاد شادؔ: نام جگن ناتھ پرشاد تخلص شادؔ تھا۔ پیشے سے حکیم تھے۔آپ نے شاعری میں **محمد** ابراہیم خان رمزؔ ٹونکی کی شاگردی اختیار کی۔ٹونک کے غیر مسلم شعراءاورادباء میں سب سے زیادہ تخلیقات آپ کی ہیں۔آپ بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔آپ کا دیوان 'مسلکِ مروارید' نام سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ 'مناظرۂ انسان و دل' ایک تمثیلی نظم لکھی۔شادؔ نے چکبستؔ کی نظم 'رامائن کاایک سین' کی طرز پر'رام چندر جی کو بن باس' نام سے شاہکار نظم لکھی۔

ریاست ٹونک کی ادبی نشستوں اور طرحی مشاعروں میں بھی کلام پیش کرتے تھے۔شادؔ کے کلام میں تاثیر و تغزل ہے۔شاعری میں عشق کی واردات کا بڑا سلیقہ سے اظہار کیا ہے۔

آنکھوں کی راہ دل میں چلے آیئے حضور
سیدھا تو راستہ ہے تمہارے مکان کا
آپ کرنے لگے غیروں سے شکایت میری
ابھی ایسی تو نہ بہکی تھی طبیعت میری

ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ: نام منوہر سہائے تھا اور تخلص انورؔ۔ٹونک میں نانیہال تھا یہیں تعلیم وتربیت پائی۔بچپن سے ہی شعرو سخن کا ذوق تھا۔ٹونک میں ہی مبادیاتِ عروض سیکھے۔انورؔ کا زمانہ تبدیلی کا زمانہ تھا۔اس لیئے قدیم وجدید دونوں رنگِ سخن کی جھلکیاں کلام میں نظر آتی ہیں۔آپ کے کلام میں بھی وہ ساری عام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس دور کے قابل ذکر شعراء کے یہاں نظر آتی ہیں۔

وہ چہرا داغ ہے عشق جمال افزا کے دامن پر
جو فرطِ اشک خون سے لالہ زارِ غم نہیں ہوتا

ڈاکٹر شیام بہاری شیامؔ: ٹونک کے باشندے تھے، پیشے سے ڈاکٹر تھے۔شاعرانہ طبیعت تھی،شاعری میں جامؔ اور صولتؔ

ٹونکی کی شاگردی اختیار کی۔آپ نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ،انکے کلام میں صفائی وسلاست،تخیل میں بلندی اورطبیعت میں روانی ہے۔شیاؔم کی شاعری حالاتِ حاضرہ کی آئینہ داری کرتی ہے۔شعرملاحظہ فرمائیے

پہلے منجدھاروں میں طوفان بپا ہوتے تھے
رہ گئے اب تو یہ کمبخت کناروں کے لئے

اس شعر میں علامت ہے پہلے عالمی سطح پرسماجی،معاشراتی اورملکی ٹکراؤ ہوتے تھے لیکن عہدِ حاضر میں یہ سبھی تصادم شہرشہراور قصبہ قصبہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

وہیں اب ہے آواز زاغ و زغن کی
جہاں تھا ابھی بلبلوں کا ترانہ

اس شعر میں شیاؔم نے زمانے اورانسانی فطرت کی تبدیلی کو بہت ہی عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔

پنڈت رام نواس ندیؔم: اہل ادب میں رام نواس ندیؔم نظم ونثر نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔آپ کوشاعری کا شغف شروع سے تھا۔آپ صولتؔ ٹونکی کے شاگرد تھے۔آپ نے جملہ اصناف میں شاعری کی۔ایک طرف ندیؔم نے قدیم رنگِ تغزل میں غزل کہیں وہیں دوسری جانب اخلاقی،قومی اورحب الوطن موضوعات پرمنظومات بھی لکھیں۔'یومِ جمہوریہ'،'جشنِ آزادی'،'بھارت'اور 'زراعت کی ترغیب' آپکی نمائندہ نظمیں ہیں۔زبان میں صفائی،بیان میں روانی اورتخیل کی بلندی ندیؔم کے کلام کی خوبی ہیں۔نمونہ کےطورپرچنداشعارملاحظہ فرمایے:

اس قدر شادماں نا ہو بلبل
موسمِ گل خزاں نہ ہو جائے

اور

وصالِ یار کی یا رب کوئی تدبیر ہوجائے
کبھی یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائے

سیٹھ اتم چند چندنؔ: آزادی کے بعد پاکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور۱۹۵۰ء میں مستقل طور پرٹونک میں اقامت اختیارکی۔ذوقِ شعروسخن طبیعت میں موجود تھا۔شاعری میں صولتؔ ٹونکی اور ہنرؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ٹونک کی علمی وادبی فضا آپکو بہت راس آئی۔انہوں نے شعروادب کےفروغ کے لیے پہلے 'بزمِ چندن' نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔چندنؔ انجمن ترقی اردوٹونک سے بھی وابستہ رہے اورانجمن کے صدر کی حیثیت سے اردوزبان وادب کےفروغ میں گراں قدرادبی خدمات انجام

دیں۔ آپ نے چار بیت، نظم اور غزل پر طبع آزمائی کی۔ ان کے تین مجموعۂ کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا 'بہار چندن' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ یہ چندن کی چار بیتوں کا مجموعہ ہے۔ چندؔن کا دوسرا مجموعۂ کلام 'سر چشمہ' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعۂ کلام ۲۲ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کا تیسرا مجموعۂ کلام 'ہمسفر' نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزلیات کے علاوہ منظومات بھی شامل ہیں۔

چندؔن کی شاعری میں قدیم رنگِ تغزل کے علاوہ ہجرت، خودی، وطن سے محبت کے موضوعات پر بھی اشعار ملتے ہیں۔ چندؔن بے ساختہ اور سادہ الفاظ میں اشعار کہتے تھے۔ انکی شاعری انکے ذاتی اوصاف کی آیئنہ داری کرتی ہے۔ چندؔن کا کلام ملاحظہ فرمایئے:

رہِ الفت میں میرا ہر قدم خود ایک منزل ہے
جہاں بھی میں ٹھہر جاؤں وہیں منزل سمجھتا ہوں
مجھے موت اچھی ہے اس زندگی سے
سہارے کا جینا کہاں چہتا ہوں
غمِ حیات غمِ عاشقی سے کم تو نہیں
ہزار غم ہیں زمانے میں ایک غم تو نہیں

آخری شعر پڑھنے کے بعد فیضؔ کی نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ' ہمارے ذہن میں آتی ہے۔ چندؔن اور فیضؔ دونوں کا زمانہ ایک تھا جو فیضؔ کے دل پر گزر رہی تھی وہی غمِ روزگار کی فکر چندؔن کو بھی تھی۔

اس مضمون کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ٹونک ہمیشہ سے ہی مشترکہ تہذیب اور روایت کی پابند رہی ہے۔ یہاں کے فرماں رواؤں نے نہ صرف غیر مسلم اہل ادب و اہل سخن کی سرپرستی کی بلکہ انکی حوصلہ افزائی کے لئے اعزاز و انعام سے بھی نوازا۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر پریم شنکر سری واستو بحیثیت طنز و مزاح نگار

پروفیسر عزیز اللہ شیرانی

شعبۂ اردو

مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور

پروفیسر پریم شنکر سری واستو کی ذات گرامی ایک خوش فکر انسان کی تھی جو فنکار بھی تھا۔ اور قومی یکجہتی کا علم بر دار بھی ۔ دردمند بھی ،تہذیب کا پروردہ بھی، خود دار و وضع دار بھی، خوش اخلاق اور بذلہ سنج بھی، فکرمند اور خوش اسلوبی کا پیکر بھی، سانولا سلونا اور گھٹیلا پن بھی، خوش مزاج اور لفظوں کا پیکر بھی، خوددار، خود شناس اور دور اندیش بھی، زباں داں، زبان شناس اور اردو کا شیدائی بھی، شوخیٔ مزاج اور ہنسنے ہنسانے والا بھی، وفادار وضع دار اور صابر بھی، شاہی انداز و آداب اور شفیق وحبیب بھی، مادری زبان اردو کا حامی، انگریزی زبان کا ماہر اور ہندی زبان کا کامل بھی۔

اردو کا شاعر، ادیب، طنز و مزاح نگار، ڈرامہ نگار بھی، انگریزی کا پروفیسر، اردو کا فن کار اور ہندی کا ساہتیہ کار بھی خلوص ومحبت کا پیکر اور انسانی جذبوں کا امانت دار بھی، زبان و تعلیم کا راہ رو، طلبہ کا ہیرو اور شاعروں کی جان بھی۔

مبصر، مدیر اور زمانہ شناس بھی، مہذب، مؤدب اور ادب نواز بھی، زباں داں، زبان شناس اور زبان کا پاسبان بھی، عقیدت کا پیکر اور محبت کا مجسمہ بھی، زندہ دل، باہمت اور باحوصلہ بھی، مقرر و نقاد اور نقد شناس بھی۔

اتنی ساری خوبیوں کا مالک پروفیسر پریم شنکر سریواستو تنہا اپنی ذات سے ایک بے مثال انسان تھا۔ یہ تمام خوبیاں محض ایک اتفاق نہیں تھا، بلکہ شنکر نے ان کا ریاض کیا تھا اسے اپنی زندگی میں پیوست کیا تھا۔ پیدائش سے لے کر انتقال تک وہ ثابت قدم اور وضع دار رہے۔

آخری عمر میں بیماریوں سے گھرے ہونے کے بعد بھی قلم اور مزاج کی شوخی ختم نہیں ہوئی۔ شاہانہ مزاج نے انہیں شہرت و ناموری سے دور رکھا۔ حالانکہ مزاج ان کا شاہانہ ہی تھا۔ وہ اپنے قلم کے شہنشاہ تھے۔

پروفیسر پریم شنکر سری واستو بمقام اجین گوالیار ۱۸ راگست ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام گیا پرشاد سری واستو تھا۔ آبائی وطن گنج مرادآباد ضلع اُنّاؤ یوپی ہے جہاں سے ان کے دادا بزرگ ۱۹۰۵ء میں ترکِ وطن کر کے جھالا واڑ آئے ۔ والیٔ ریاست جھالا واڑ کی فرمائش پر ان کے مشیر خاص مقرر ہوئے ۔ پریم شنکر سری واستو کی تعلیم میرٹھ، جھالا واڑ، اجمیر اور لکھنؤ میں ہوئی۔ مڈل اختیاری مضمون (اردو، فارسی) جھالا واڑ سے میٹرک ۱۹۳۴ء میں (اختیاری مضمون اردو) سے کیا۔

بی اے اجمیر سے ۱۹۳۸ء میں کیا۔ ایم اے انگریزی میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں کیا۔ جسونت کالج و ایس ایم کے کالج جودھپور میں بحیثیت انگریزی لکچرر ۱۹۴۳ء میں مقرر ہوئے۔ پھر اس کے بعد سینئر لکچرر (انگریزی) کے عہدے پر گورنمنٹ کالج اجمیر میں ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۱ء خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد ڈونگر کالج بیکانیر میں پروفیسر اینڈ ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف انگلش کے معزز عہدے پر ۱۹۷۱ء میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۵ء میں ۵۵ سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ ہوا۔

۱۹۴۱ء میں پریم شنکر سری واستو کی شادی جودھپور میں ہوئی ان کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ ۱۹۷۶ء سے جودھپور میں سکونت رہی۔ رٹائرمینٹ کے ایک سال بعد ۱۹۷۶ء میں ان کی بیگم راہی ملکِ عدم ہوگئیں۔

پریم شنکر سری واستو نے اردو زبان وادب کی خوب خدمت کی۔ انہوں نے انجمن ترقی اردو راجستھان شاخ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۹ء نائب صدر کی حیثیت سے اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی اودے پور کی اردو کمیٹی کے کنوینر رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۶ء تک چلا۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں راجستھان میں اردو اکیڈمی کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ۱۹۷۷ء میں ان کی کل اردو خدمات کے صلے میں اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں راجستھان اردو اکیڈمی نے ''ادیبِ خصوصی'' کا لقب دیا اور اعزاز کیا۔

سہ ماہی رسالہ نخلستان کے بانی و مدیر تھے جو ۱۹۶۴ء میں ساہتیہ اکادمی اودے پور سے شائع ہوتا تھا بعد میں راجستھان اردو اکیڈمی کی تشکیل کے بعد اردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے لگا۔ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی سے ۱۹۶۶ء میں ان کی ایک کتاب ''راجستھان کے موجودہ اردو شاعر'' ہندی رسم الخط میں شائع ہوئی۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے جس سے ریسرچ اسکالرس آج تک استفادہ کررہے ہیں۔ تشکیل راجستھان اردو اکیڈمی کے بعد پروفیسر موصوف ۱۹۸۰ء میں اکیڈمی کے ممبر رہے۔ اور مالی کمیٹی میں بھی آپ کی شمولیت رہی۔

آپ نے کل ہند انجمن ترقی اردو، ترقی پسند مصنفین کے مالی اشتراک سے منعقدہ عالمی مزاح کانفرنس کے علاوہ اردو سے متعلق کانفرنسوں اور جلسوں میں خوب شرکت کی۔

آپ کئی انجمنوں سے جڑے ہوئے تھے۔ پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن راجستھان کے فعال رکن رہے۔ 'جودھپور' میں سری واستو صاحب نے طنزیہ ومزاحیہ مصنفین کو ساتھ لے کر ''بزم خوش دلان جودھپور'' کی بنیاد رکھی جس کا اجراء اپریل ۱۹۸۵ء میں کیا گیا۔ تمام ادباء شعراء اور طنز ومزاح نگاروں نے پروفیسر پریم شنکر سری واستو کو فاؤنڈر صدر کی خدمات کے لئے منتخب کیا۔ خوش دلان جودھپور نے سری واستو صاحب کی نگرانی میں طنز ومزاح کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی خصوصی نشستوں میں مدعو کیا۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

پریم شنکر سری واستو کی ادبی تخلیقات : شری واستو نہ صرف اردو بلکہ انگریزی کے بھی مصنف تھے۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات ومضامین نثر میں ہیں شاعری محدود رہی۔ بقول خود اُن کے ''ذہنی تضاد کی کارفرمائی کہئے کہ شعروں میں سنجیدگی ہوتی ہے۔ لیکن نثر میں گدگداہٹ۔ یہ شاید اس لئے کہ میری محبوب صنف طنز ومزاح ہی ہے۔ مجموعی طور پر مزاح کو طنز پر ترجیح دیتا ہوں۔

شرط بس یہی ہے کہ مزاح محض تفریحی نہ ہو۔ اعلیٰ طنز اسے مانتا ہوں جو مزاح کے شکم سے پیدا ہو۔ وقتی سیاست کو میں اپنی تخلیقات کا موضوع بننے کے لائق نہیں سمجھتا۔

میرے نزدیک حقیقی طنز ومزاح ایک فلسفیانہ زاویۂ فکر ونظر'' ہے۔ پریم شنکر سری واستو نے ۱۹۴۷ء سے باقاعدہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیا۔ تب سے آخری عمر تک تقریباً ۱۵۰ طنزیہ ومزاحیہ مضامین/انشائیے لکھے ہیں۔ ان میں پریم شنکر سری واستو طنز ومزاح کے میدان میں خوب سے خوب تر طنز ومزاحیہ مضامین لکھتے رہے لیکن لڑکپن سے رئیسانہ مزاج ہونے کی وجہ سے تخلیقات شائع کروانے کی توفیق شاذ ونادر ہی رہی۔

کچھ ادبی، تنقیدی، تبصراتی، تاثراتی، مضامین اردو اور انگریزی میں نشر ہوئے اور کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (دیوناگری)۔ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

(2) Arif Naqshbandi : The Man and Poet

تقریباً ۱۰۰ صفحات کی کتاب انگریزی میں طباعت کی منزل سے گذری۔ ۱۹۹۵ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

(3) ''چھچھے'' طنز ومزاحیہ دیوناگری رسم الخط میں ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

(4) ''راجستھان کے اردو طنز ومزاح نگار'' ناشر: راجستھان اردو اکیڈمی ۱۹۹۱ء

(5) مونوگراف، رمزی اٹاوی (جودھپور) ناشر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور

پروفیسر سری واستو کی ادبی خدمات کے صلہ میں ان کو انعام واعزاز سے بھی نوازا گیا۔

(1) اعزاز ''ادیب خصوصی'' ۱۹۷۷ء منجانب راجستھان ساہتیہ اکیڈمی اودے پور

(2) مجموعی اردو خدمات پر انعام واعزاز راجستھان اردو اکیڈمی جے پور ۱۹۸۷ء

(3) خدمات اردو پر انعام واعزاز ۱۹۹۳ء منجانب راجستھان بورڈ آف مسلم وقفس جے پور

سری واستو چونکہ انگریزی کے پروفیسر تھے اور اردو کے مصنف۔ لہٰذا ریٹائرڈ ہونے کے بعد آپ نے ''انگلش انسٹی ٹیوٹ'' فار انگلش اسپیکنگ، رائٹنگ ریڈنگ، تھرولسینگ کا قیام کیا جس کے آپ پروفیسر اینڈ ڈائریکٹر تھے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ آپ

نے ملک و بیرون ملک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے والے یا مقابلاتی امتحانوں میں شرکت کرنے والے امیدواروں کو انگلش اسپیکنگ کے جدید طریقوں سے پڑھایا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنے امتحان میں کامیابیاں حاصل کریں۔

سفرنامہ: پروفیسر موصوف نے ۱۹۷۹ء میں کناڈا کا سفر کیا۔

ذاتی شوق: پروفیسر موصوف گنگا جمنی تہذیب کی زندہ مثال تھے۔ ہر مذہب وملت کے لوگوں سے پرخلوص انداز سے گفتگو کرتے تھے۔ پان اور سگار کا بے حد شوق تھا۔ اردو کی کتب اور رسائل (اردو، ہندی اور انگریزی) خرید کر پڑھتے تھے۔

ادبی تخلیقاتی ذہن اور قلم کی کاوشوں کو پروان چڑھانے کے لئے شب بیداری کرتے تھے لیکن صبح جلدی اٹھنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ شادی کے ہنگاموں اور بھیڑ بھاڑ والی دعوتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ لذیذ کھانوں کے شوقین تھے۔ پروفیسر موصوف نے بھارتی ودھا بھون جودھپور شاخ میں تعلیم بالغان کے تحت اردو پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری کیا۔

پروفیسر موصوف سے راقم کی ملاقات: میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۵ء سے شروع ہو گیا تھا۔ ادبی تقریبات میں سیمیناروں میں مقالات پڑھنا، اخبار و رسائل میں چھپنا۔ آکاش وانی جے پور سے کہانی اور تقاریر کی نشریات اور اردو تدریس کی خدمات میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً ۲۱ سال تھی۔ اس جواں سالی میں پروفیسر صاحب سے راجستھان اردو اکادمی جے پور کی ایک تقریب میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی ہی ملاقات میں پروفیسر صاحب سے ادبی دوستی ہوگئی۔ پھر خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملاقاتیں بھی ہوئیں کبھی جودھپور میں کبھی جے پور اور کبھی ٹونک میں۔ یہ ملاقاتیں ادبی اور انسانی رشتوں کی یادگار بن گئیں۔

یہ ادبی دوستی اس وقت اور پروان چڑھی جب راجستھان اردو اکادمی جے پور نے ۱۹۸۸ء میں ایک پروجیکٹ کے تحت ''راجستھان کی طنز ومزاح نگاری'' پر ایک کتاب پروفیسر صاحب کو دی۔ اس کے انتخاب اور ترتیب وتدوین کا مرحلہ تھا پروفیسر صاحب نے اس سلسلہ میں مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے اس کتاب کی ترتیب وانتخاب میں ان کی مکمل مدد کی اور وہ کتاب چھپ گئی۔ پھر تو پروفیسر صاحب کی مہربانیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ انہوں نے خوش دلانِ جودھپور سے ۲۰ نومبر ۱۹۹۳ء میں مجھے طنز ومزاحیہ نشست میں مدعو کیا۔ جہاں میں نے اپنا طنزیہ ومزاحیہ مضمون ''ایک اور جشن'' پڑھ کر سنایا۔ جسے جودھپور کے ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ خوش دلان جودھپور کی یادگار ادبی نشست اور اہل جودھپور کی شاندار پرخلوص مہمان نوازی نے یادوں کے دریچوں میں ایک مخصوص مقام بنالیا۔ سوچنا کیندر سے لے کر پروفیسر صاحب کا رنگارنگ، زعفران زار اور خوش فکر رہائشی مقام، خان لیاقت اللہ خاں اور صداقت اللہ خاں کی وسیع اور پرسکون حویلی، جہاں انہوں نے دعوت خاص کا اہتمام کیا تھا۔ اور ہماری میزبانی فرمائی تھی۔ لذیذ کھانے کھلائے تھے اور جودھپور کی ادبی گفتگو کی تھی۔ مدن کیولیا اور محمد صدیق بھی اس میں شامل تھے۔ ان کی خاندانی شرافت، انسان دوستی، مہمان نوازی، بے لوث ادب نوازی، پرلطف مگر سنجیدہ گفتگو قابل تعریف تھی۔ راز دان صاحب اور مرودھر مردل صاحب

کی اردو دوستی اور اردو نوازی جمہوری قدروں کی شان کو دوبالا کر رہی تھی۔

پروفیسر موصوف سے یہ ادبی سلسلہ پروان چڑھتا رہا۔ وہ مسلسل ادبی خطوط مجھے لکھتے رہے اور میں نے بھی پابندی سے ان کے جواب دیئے۔ ان کے تمام ادبی خطوط پر تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

زیرِ ترتیب کتاب کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ پروفیسر صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ان کی زندگی میں ہی شائع کیا جائے۔ اس کے لئے میں ٹونک سے جودھپور بھی آیا۔ ایک دو نشستوں کے بعد ان کے مضامین دیکھے جو اردو میں خوشخط لکھے تھے۔ ان کے انتقال کے کافی عرصہ گذر جانے کے بعد میری جودھپور آمد پر ''خوش دلانِ جودھپور'' کے سکریٹری انل انور صاحب مجھ سے ملنے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے گیسٹ ہاؤس آئے۔ اور پروفیسر صاحب کے وہ تمام طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہندی میں ٹائپ کیے ہوئے میرے سپرد کئے۔

یہ وہی مضامین تھے جو اردو میں خوش خط تھے انتقال کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا

لیکن پروفیسر صاحب نے انہیں اسی دوران ہندی الفاظ کے اضافے یا ترجمے کے ساتھ ٹائپ کروایا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کو اردو میں تبدیل کرنا یا ترجمہ کرنا اشد ضروری تھا کیوں کہ اصل اردو مسودہ ہمارے سامنے نہیں تھا۔ لہٰذا ہندی مسودہ کو اردو میں ترجمہ کیا گیا مشکل ہندی الفاظ کو اردو میں تبدیل کیا اور بعض رائج العام ہندی الفاظ جوں کے تیوں لے لیے گئے۔ اس طرح ان طنزیہ مزاحیہ مضامین کو ترتیب دے کر اردو میں کمپوزنگ کرایا گیا۔

پروفیسر صاحب کی دیرینہ خواہش کا احترام کرتے ہوئے خوش دلانِ جودھپور کے سکریٹری جناب انل انور صاحب نے مجھے اس کو مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ میں نے پروفیسر پریم شنکر سری واستو صاحب کے اصل ہندی مسودہ کو چیک کیا۔ پھر اسے اردو میں منتقل کیا۔ مشکل ہندی الفاظ کے اردو میں ترجمے کئے۔ اور اس کتاب کا عنوان ''پروفیسر پریم شنکر سری واستو شنکر کے منتخب طنزیہ و مزاحیہ مضامین'' رکھا۔

اس انتخاب میں طنزیہ و مزاحیہ ۱۳؍ مضامین ہی شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر مضامین آکاش وانی جودھپور سے نشر شدہ ہیں۔ کچھ مطبوعہ ہیں۔ زیادہ تر مضامین غیر مطبوعہ ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین زندگی کے حقیقی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً سماجی سروکار، مصلحت آمیزی، انسانی فطرت، حالاتِ حاضرہ کے مسائل، ازدواجی زندگی کے لطف، سماجی زندگی کی جھلکیاں، سیاسی پیچ و خم، نئی پرانی تہذیب کے مرقعے، اخلاقیات، رسومات، بے روزگاری کے المیے، دوستوں، رشتہ داروں سے رقابتیں اور رفاقتیں زندگی گزارنے کے گُر۔ اور اخلاق کی تعلیم لطیف طنز و مزاح کے ساتھ بغیر کسی تضحیک کے لفظی اور محاورتی انداز سے مزاحیہ رنگ بکھیرتے ہیں۔ ان کے طنز میں ایک اصلاحی اور فکری پہلو ہوتا ہے وہ سماج کا نوحہ بھی ہے اور برائیوں، کمیوں، عیبوں، تکلیفوں کی جراحی بھی کرتا ہے۔ قہقہہ زاری بھی

ہے۔اوراظہار تاسف بھی مسائل کی پیچیدگیاں بھی ہیں اوران کے حل بھی نظر آتے ہیں۔

مضامین کی زبان و بیان سلیس عام فہم اور دلچسپی سے لبریز ہے۔اس میں پروفیسر صاحب کا حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز قاری کی دلچسپی بڑھاتا ہے۔طنز و مزاح کے فن پر پروفیسر صاحب کی گرفت خوب ہے۔انگریزی کے ماہر ہونے کے سبب مضامین میں جگہ جگہ موقع ومحل کے اعتبار سے انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں جو گراں نہیں گذرتے ، بلکہ دورِ جدید کے نظریات ومعلومات میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں مزاح کا پہلو زیادہ دل نشین ہے۔تہذیبی مرقعے جگہ جگہ نظر آتے ہیں ان میں تہذیب وشائستگی کے ساتھ تلخ لب ولہجہ بھی ہنسنے ہنسانے کے لئے اور سبق سیکھنے کے لئے کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

بحثیت مجموعی پروفیسر صاحب کی زندگی کے گذرے ہوئے سچے واقعات، حادثات، کیفیات اوران کی زبان و بیان، برتاؤ، رکھ رکھاؤ اور شاہانہ انداز کی جھلکیاں جا بجا ان کے مضامین میں ملتی ہیں۔مختصراً ان کے چند مضامین کے موضوع اور فن پر گفتگو کی جاتی ہے۔

(1) پہلا مضمون ''معاف کیجئے گا'' ہے جس میں وقت کی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔

(۲) آج کے ترشنکو'۔میاں بیوی کی نوک جھونک، آسمان میں لٹکا ہوا شخص، سر نیچے اور ٹانگیں اوپر مسخرا کردار ہے۔

(۳) ''بھگوان بچائے سمپادکوں سے''اس میں تخلیق کار اور سمپادکوں کے تلخ تجربات پیش کئے ہیں۔

(۴) ''شکایت باپ کو اپنے بیٹے سے'' باپ بیٹے کی نوک جھونک، باپ کی شکایت بیٹے سے، موجودہ معاشرے پر رشتوں کی اہمیت پر طنز کیا ہے۔

(۵) ''اور بنیں گے مالک مکان'' کرائے دار اور مکان مالکوں کی تکرار کی داستان بڑی دلچسپ اور نصیحت آمیز ہے۔

(۶) ''مرزا بے تکلف'' اس میں دوست ہیں۔مانگنے کھانے والے ہیں مرزا کے مارے ہیں۔

(۷) ''داستان ہوٹل کے ایک کمرے کی اسی کی زبانی'' موجودہ معاشرہ کا ابتذال اور قدروں کی پامالی کی پول کھولی ہے۔

(۸) ''پان لبوں کی شان'' اس میں پرانے اور نئے زمانے کے پان کھانے کے آداب وطریقے پیش کئے ہیں۔

(۹) ''نائن فائیوزا'' ریاضی کی مشکلات اور کمزور استادوں پر طنز، پرانی تعلیمی نظام کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔

(۱۰) ''غصہ کا بھوت'' غصہ کی کیفیت میں ہوش بھول جاتا ہے۔طالب علم ہو کہ عام باشندہ کوئی اس سے بچا نہیں ہے۔

(۱۱) ''کیا وہ بھی زمانہ تھا'' بزرگوار دوست کا واقعہ، لڑکپن، جوانی، ادھیڑپن کی منزلیں بتائی ہیں۔

(۱۲) ''بات ریٹائرڈ ساتھیوں کی'' نوکری کی قید اور آزادی، ٹرانسفر کا دکھ۔سردار جی کا واقعہ، اسکول کا مدرس اور پنڈت جی کے

واقعے بیان کئے ہیں۔

(۱۳) ''وہ بھی منہ میں زبان رکھتی ہے'' بیوی شوہر کی نوک جھونک ہے۔

(۱۴) ''پیسے نہیں ہیں جیب میں'' خالی جیب کی تکالیف بیان کی ہیں۔

امید کی جاتی ہے کہ پروفیسر پریم شنکر سری واستو شنکر کے یہ تمام طنزیہ ومزاحیہ مضامین علاقائی تحقیق کا حصہ بنیں گے۔ اوراس سے یقیناً استفادہ کیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

منشی دیبی پرشاد بشّاش اور ان کے سنسکرت؍اردو تراجم

ڈاکٹر شاہد احمد جمالی۔

مکان نمبر، 629 محلّہ بساطیان، رام گنج بازار، جے پور، 302003

منشی دیبی پرشاد کا مختصر تعارف: منشی دیبی پرشاد کے والد منشی تھمن لال بہجتؔ کی شادی جے پور میں حکیم شنکر لال کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ منشی دیبی پرشاد اپنے ننھال میں ۱۸۴۸ء میں جے پور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں ان کے والد اجمیر میں صاحب زادہ عبدالکریم خاں شرقؔ کی ملازمت میں تھے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنی اہلیہ اور بیٹے دیبی پرشاد کو بھی اجمیر بلا لیا۔ اجمیر میں ہی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ زمانے کے رواج کے مطابق اردو عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس دوران ایک مرتبہ پھر منشی جی جے پور اپنے نانا کے پاس آئے اور جے پور میں مولوی حفیظ اللہ اور مولوی امان اللہ سے ایک سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے والد کے پاس اجمیر آ گئے۔ تعلیم کے بعد وہ بھی صاحبزادہ عبدالکریم شرقؔ کے ملازم ہو گئے۔ لیکن ۱۸۷۱ء میں وہ جودھپور آ گئے۔ اور محکمہ اپیل میں نائب سرشتہ دار کی عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں ترقی پا کر منصف کے عہدے تک پہنچ گئے۔

لالہ سری رام دیبی پرشاد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''منشی دیبی پرشاد خلف منشی تھمن لال بہجت قوم کایستھ۔ ان کے بزرگ شہر بھوپال کے رہنے والے تھے۔ یہ خود عرصہ سے اجمیر میں سکونت پذیر ہیں۔ اردو انشاء پردازی اور تصنیف و تالیف، کتب جغرافیہ، اور تاریخ کا زیادہ تر شغل رہتا ہے۔ اوائل عمر میں صاحبزادگان ٹونک کی سرکار میں ملازم رہے۔ اسکے بعد ریاست جودھپور میں ملازم رہے۔ لطائف ہندی، افسانہء خرد افروز، گلدستہ ادب، وقائع راجپوتانہ، احکام نوشیرواں، تاریخ تزک ہند، تذکرہ شعرائے ہنود، ان کی یادگار ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ کے قریب ہے۔ اور ریاست میں منصفی کے عہدے پر ممتاز ہیں۔''

(خم خانہ جاوید۔ جلد اول۔ مخزن پریس، دہلی۔ ۱۹۰۸ء۔ ۶۹۷۔۶۹۶)

شرف الدین یکتاؔ، دیبی پرشاد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> 'لالہ دیبی پرشاد بشاش منشی تھمن لال بہجت کے فرزند تھے۔ ۱۹۰۴سمت (۱۸۴۸ء) میں اپنے نانا حکیم شنکر لال کے گھر جے پور میں پیدا ہوئے۔ اجمیر میں تعلیم تربیت پائی۔ گلستاں تک دادا سے پڑھا بعد ازاں مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ٹونک چلے گئے۔ صاحب زادہ عبدالکریم خاں کی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔ نواب وزیرالدولہ کی وفات کے بعد جب نواب محمد علی ریاست کے وارث ہوئے تو صاحب زادہ

عبدالکریم خاں مع اپنے فرزند محمد خاں کے اجمیر چلے گئے۔ بشاش بھی ان کے ہمراہ اجمیر آ گئے۔'

(بہار سخن۔ شرف الدین یکتا۔ ادارہ بہار سخن۔ حیدرآباد سندھ۔۱۹۶۳ء ص۔۵۰۔۵۱)

جودھپور آنے کے بعد آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔۱۸۷۲ء میں ان کی پہلی کتاب ''میزان عدالت'' شائع ہوئی۔۱۹۲۳ء میں ان کی آخری کتاب 'لطائف ہندی'' شائع ہوئی۔۵۱/سال کے عرصہ میں منشی دیبی پرشاد نے چار درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

'منشی دیبی پرشاد راجپوتانہ کے واحد ایسے مصنف ہیں جن کو کئی کتابوں پر انعامات سے نوازا گیا۔ یہاں تک کہ ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے بھی ان کو نوازا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو مورخ راجستھان کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔'

(تذکرہ شعرائے راجپوتانہ، ۱۹۵۰ء تک۔ مرتبہ شاہد احمد جمالی۔ ناشر راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔ ۲۰۱۷ء۔ ص۔۵۶۴)

دیبی پرشاد بشاش کی معرکتہ آراتصنیف ''تذکرہ آثارالشعرائے ہنود' سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ راجستھان میں لکھا گیا شعراء کا اولین تذکرہ ہے۔ آپ کی تصنیف کردہ کتابوں کی فہرست اکثر شائع شدہ کتاب کے آخری اوراق پر نظر آتی ہے۔

وہ فہرست یہاں درج کی جارہی ہے۔

۱۔افسانہ خرد افروز۔۲۔گلدستہ اخلاق۔۳۔رسالہ چہل جواب تاریخی۔۴۔تاریخ میواڑ۔۵۔کارنامہ نو آئین۔۶۔لطائف ہندی۔۷۔خواب راجستھان۔۸۔سوانح عمری نوشیروان۔۹۔تعلیم النساء۔۱۰۔تاریخ تزک ہند۔۱۱۔جواہر تعبیر علم کے خواب میں۱۲۔تذکرہ شعرائے ہنود۔ ۱۳۔معیارالشعراء۔۱۴۔مجموعہ مضامین دلنشین۔۱۵۔مصائب زندگی۔۱۶۔نفائس التواریخ۔۱۷۔ناری نورتن۔

یہ فہرست نامکمل ہے۔اس میں مندرجہ ذیل کتب کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

'۱۔انتخاب، نادرہ۔۲۔فضلائے، ہند۔۳۔تفریح الطلبا ء۔۴۔خان خاناں نامہ۔۵۔شاہ جہاں نامہ۔ ۶۔تذکرہ اکابر اسلام۔ ۷۔سوانح عمری راجہ بیربل۔۸۔افتخار التواریخ۔ (ترجمہ امیر نامہ)۔۹۔شوانح عمری بادشاہ اکبر۔۱۰۔سوانح عمری رانا رتن سنگھ۔۱۱۔سوانح عمری رانا اودے سنگھ۔۱۲۔سوانح عمری رانا پرتاپ سنگھ۔۱۳۔سوانح عمری راجہ مال دیو۔۱۴۔سوانح عمری راو بیکاجی۔۱۵۔سوانح عمری راواجیت سنگھ۔۱۶۔تاریخ سروہی۔۱۷۔سوانح عمری نواب امیر خاں۔۱۸۔ہونہار بالک۔۱۹۔سوانح عمری راجہ پرتھوی راج۔ان کے علاوہ راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں کی تواریخ بھی انھوں نے لکھی ہیں۔

راجستھان میں بھی سنسکرت کی کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے ہیں۔'مورخ راجپوتانہ' کے لقب سے مشہور منشی دیبی پرشاد بشاش راجستھان کی واحد ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے براہ راست سنسکرت کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ یہاں میں ان کی دو

نہایت اہم کتابوں کا ذکر کرتا ہوں۔

ا۔ ''تاریخ راج پرستی''۔ ۲۔ ''تاریخ تزک ہند''۔

تاریخ راج پرستی۔

تاریخ راج پرستی میواڑ کی مختصر تاریخ ہے۔ جو سمت ۱۷۱۸ (۱۶۶۱ء) سے شروع ہو کر سمت ۱۷۳۲ میں مکمل ہوتی ہے۔ غور طلب ہے کہ سمت ۱۷۱۸ میں ہی راج سمند تالاب کی تعمیر کا کام شروع ہوا تھا۔

منشی دیبی پرشاد نے اس کے ترجمہ کے لئے پنڈت رام کرن جی سے بات کی۔ جن کا تعلق ریاست ٹونک سے تھا۔ منشی جی نے ان سے درخواست کی کہ اس کا ترجمہ مجھے اردو میں کرادیں۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے اس کو قبول کیا۔ چنانچہ پنڈت جی اس کا ترجمہ حرف بہ حرف بولتے جاتے تھے اور منشی جی اس کو اردو میں لکھتے جاتے تھے۔ کئی روز کی مسلسل محنت کے بعد یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں مکمل ہوئی۔ لیکن اس کی اشاعت چار سال بعد ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ بڑے سائز کے چوراسی صفحات کی یہ کتاب ۱۸۷۵ء میں منشی نول کشور پریس کانپور سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں سولہ 'سرگ' یعنی باب ہیں۔ جن میں اودے پور کے راناؤں کا خاندانی نسب نامہ ہے، تاریخی واقعات جیسے علاء الدین کی چڑھائی، رانا سانگا کی لڑائیاں، راجہ مان سنگھ کے حملے وغیرہ سے لے کر رانا راج سنگھ اور، اورنگ زیب کے دور حکومت تک کا ذکر ہے۔ راج سمند تالاب کی تعمیر اور رانا راج سنگھ کے جانشینوں کا بھی ذکر ہے۔ کتاب کے آخر میں تین تتمے ہیں۔

تاریخ راج پرستی، ایک بہت ہی عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس کے تعارف میں منشی دیبی پرشاد لکھتے ہیں۔

'واضح ہو کہ یہ راج پرستی، میواڑ میں راج سمند تالاب کے اوپر طاقوں میں کھدی ہوئی ہے۔ اس کو رانا راج سنگھ کے وقت میں رنچھور بھٹ نے بزبان سنسکرت تصنیف کی تھی۔ اور ماہ 'سودی' پورنماشی سمت ۱۷۳۲ (۱۶۷۵ء) میں کنور جے سنگھ نے ان طاقوں میں کندہ کرادی، سو اب تک موجود ہے۔'

(دیباچہ، تاریخ راج پرستی، ص ا منشی نول کشور پریس کانپور۔ ۱۸۷۵ء)

اس کتاب کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے منشی دیبی پرشاد لکھتے ہیں۔

'رنچھور بھٹ اپنا حسب و نسب لکھتا ہے کہ وہ ذات کا تیلنگ برہمن ہے۔ اور مدھوسودن بھٹ کا بیٹا ہے۔ اس کی ماں مسماۃ بنّی، بدو ناتھ گسائیں کی بیٹی ہے۔ اس کا ایک بھائی لکشمن بھٹ بھی تھا۔ سو اس کے لئے مصنف کہتا ہے کہ اس نے لکشمن بھٹ کو پڑھانے کے لئے گوگوندا نامی گاؤں کے تالاب کے حالات، جس کو رانا راج سنگھ نے بنایا ہے سنسکرت میں لکھتا ہوں۔

(دیباچہ، تاریخ راج پرستی، ص۔۳۔منشی نول کشور، کانپور۔۱۸۷۵ء)

کل ملا کر یہ کتاب راجپوتانہ کی تواریخ میں ایک اہم کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔تاریخ تزک ہند۔

منشی دیبی پرشاد کی دوسری کتاب ''تاریخ تزک ہند'' ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۶ء میں مطبع رضوی دہلی سے شائع ہوا۔دوسرا ایڈیشن مطبع خیر خواہ عالم، دہلی سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔اس میں کل ۶۵ صفحات ہیں۔بسم اللہ سے شروع کرتے ہو ئے اس کے تعارف میں وہ لکھتے ہیں۔

'واضح ہو کہ یہ چند اوراق کہ جن کا ترجمہ سنسکرت سے اردو میں کیا جاتا ہے۔مجھ کو پنڈت گنگا سہائے جی اہل کار ریاست بوندی کے پاس سے ملے تھے۔اور اس بات کا علم کہ یہ ورق کس کتاب کے ہیں، اور اس کے بنانے والے کا کیا نام ہے، خود پنڈت جی کو بھی نہیں تھا۔وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ یہ اوراق ''کالند کا پرکاش'' نامی ایک سنسکرت کی کتاب کی شرح سے کچھ تعلق رکھتے ہیں۔سو یہ ان ہی اوراق سے معلوم بھی ہوتا ہے بلکہ اس میں اتنا اور بھی لکھا ہے کہ کالند کا پر کاش کا مصنف سومناتھ ساکن شیو پور ہے۔اور اس کی چھوٹی اور بڑی دو اور شرحیں بھی ہیں۔جن کا حوالہ اکثر ان اوراق میں آیا ہے۔لیکن چونکہ وہ دونوں شرحیں مع اصل کے ہمارے سامنے نہیں آئی ہیں اس لئے ہم ان کی نسبت کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

(دیباچہ۔تاریخ تزک ہند۔ص۔۲)

'مصنف نے مہابھارت کے بعد سے حال کے زمانے تک کا احوال، گو وہ کتنا ہی مختصر ہو مگر ایسا سلسلہ وار اور ٹھیک ٹھیک لکھا ہے کہ اس سے نہ صرف راجاؤں کا ہی حال معلوم ہوتا ہے بلکہ بڑے بڑے رشیوں، آچاریوں اور نامی گرامی سنسکرت کے مصنفوں کا احوال مع سنہ اور سال کے پایۂ تحقیق کو پہنچتا ہے۔اور زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے اس تمام مدت کے حالات کو آزادانہ تحقیقات کے ساتھ لکھا ہے۔'(ص۔۳)

اس کتاب کی طرز سے ایسا پایا جاتا ہے کہ اس کا مصنف دکن کا رہنے والا ہے اور یہ بات سمت کی جگہ ''سالباہن کا شک' لکھنے سے اور 'ستارہ والوں' کا نسب نامہ درج کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔'(ص۔۸)

واضح ہو کہ سالباہن خاندان کے راجہ گجرات کے بلبھی پور میں ہوا کرتے تھے۔جو سمندر کے کنارے واقع تھا۔

اس ترجمہ کی بابت منشی دیبی پرشاد لکھتے ہیں۔

'یہ ترجمہ حتی الوسیع بہت صحیح کیا گیا ہے۔ٹونک میں رام کرن اور منا لال دو ہی بڑے پنڈت ہیں۔سنسکرت کی کلیت

اور زبان دانی کا خاتمہ یہاں ان دونوں پر ہی ہے۔ میں نے اس ترجمے میں ان دونوں سے مدد لی ہے۔ ترجمہ تو منّا لال جی سے کرایا اور اس کی صحت ونظر ثانی میں رام کرن جی کو شریک کیا۔ اس پر بھی جو کوئی غلطی رہ گئی ہو تو 'ناظرین سے امید ہے کہ اس کو درست کر دیں۔'' (ص۔۸)

یہ کتاب ہندوستان کے تعلق سے سنہ ۱۸۴۴ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کا مصنف آغاز کتاب میں لکھتا ہے کہ

'جو راجے مہاراجے کہ اگلے زمانے میں گزرے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک حال اگلے پنڈتوں نے بیان نہیں کیا ہے۔ اور جو حال کہ بہ قید زمان و مکان لکھا جاتا ہے، اس کو یون لوگ تاریخ کہتے ہیں۔ پس یہ تاریخ بھی نیتی شاستر کا ایک جزو ہے۔ ملک وزمانہ کا حال معلوم کرنے کے لئے مفید اور کارآمد ہے۔' (ص۔۱۲)

اس کتاب میں جگہ جگہ پیشن گوئیاں بھی کی گئی ہیں، جو زمانے کی تبدیلی اور نئے حکمرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ آخری سات صفحات میں ہندوستان کے مشاہیر کے نام، راجاؤں کے نام، قوموں کے نام، قدیم کتابوں کے نام، قدیم مصنفین کے نام، قدیم ملکوں اور شہروں کے نام، اور زمانوں کے نام سنسکرت اور اردو، دونوں زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں۔

آخری سطور اس کتاب کی یہ ہیں۔

'الحمد اللہ کہ کتاب نایاب موسوم بہ تاریخ تزک ہند، مولفہ ومترجمہ منشی دیبی پرشاد صاحب خلف منشی نتھن لال بہجتؔ، ساکن قدیم بھوپال، حال مقیم اجمیر، حسب فرمائش مصنف ممدوح مصبع خیر خواہ عالم، دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی۔ تمام شد۔ ۱۳۰۰ ہجری مطابق ۱۸۸۳ء۔' (صفحہ۔۶۴)

☆☆☆☆☆

'للتا پرشاد شآد حیات اور خدمات: راجستھان'

ڈاکٹر نادرہ خاتون
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اردو گورنمنٹ گرلس کالج کوٹہ

للتا پرشاد نام شاد تخلص ۲۲ جون ۱۸۸۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد منشی جنگ بہادر خود اردو فارسی کی جیّد عالم تھے اور شعر وسخن کا اعلی شوق رکھتے تھے۔

شآد کے خاندان کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کا خاندان اردو اور فارسی زبان کی خدمات اپنے اجداد کے زمانے سے کرتا رہا ہے۔ منشی جنگ بہادر جنگ صاحب دیوان شاعر تھے۔موصوف نے اپنے والد کے انتقال کے بعد جب کاغذات ٹٹولے تو ان میں دیمگ لگنا شروع ہوگئی تھی۔شآد کو بے حد افسوس ہوا،اور ان کے کلام کو معرکہ جنگ کے نام سے زیور طبع سے آراستہ کروایا۔اس مرتب مجموعہ میں کوٹہ کی مشہور ومعروف شخصیت مفتوں کوٹوی جنگ بہادر جنگ کی تعریف میں لکھتے ہیں:''حقیقت میں وہ ایک جادو بیان تھا'

'

(صفحہ نمبر ۴۴ بعنوان میدان سخن میں جنگ کی معرکہ آرائیاں۔ازمفتوں کوٹوی)

شآد کے چھوٹے بھائی بابو بنی پرشاد بھی شعروشاعری میں دخل رکھتے تھے اور رنگ تخلص رکھتے تھے۔شآد کے دادا بھی فارسی زبان میں کامل دسترس رکھتے تھے اور نجی خطوط فارسی زبان ہی میں لکھا کرتے تھے۔ یہاں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو اور فارسی زبان کے لئے نہ صرف صوبائی سطح پر بلکہ ملکی سطح پر بھی غیر مسلم حضرات نے اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اسی لئے پریم شنکر شری واستو''راجستھان کے موجودہ اردو شاعر میں رقم طراز ہیں:

'شاد باعزت کائستھ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔فارسی اور اردو زبان ان کے خاندان کا اوڑھا اور بچھونا تھی۔شآد کو شاعری ورثے میں ملی تھی کم عمری ہی میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔کلام پر اصلاح اپنے والد بزرگوار منشی جنگ بہادر جنگ سے لی۔اور شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔''

ہندوستان پر انگریزی حکومت قابض تھی۔تحریک آزادی کی جدوجہد بام عروج پر تھی۔اسے میں ملازمت ترک کر کے گاندھی کے عدم تعاون تحریک سے وابستہ ہوئے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح بے شمار نوجوانوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے قربانیاں اسی طرح شاد بھی حبّ الوطنی کے جزبے سے سرشار تھے۔ملک کی عظمت انہیں بے حد عزیز تھی۔وہ

بھائی چارہ اور مذہبی تنگ نظری سے بے حد دور تھے۔

اس لئے وہ اپنے ایک شعر میں لکھتے ہیں:

تعجب ہے کہ تم نے شآد کو اب تک نہ پہچان

مسلمانوں میں ہندو، ہندوں میں مسلمان تھا

شآد نے دوبارہ ریلوے میں خزانچی اختیار کی اور کوٹہ کواپنا وطن ثانی بنایا اور اپنے انتقال تک کوٹہ ہی سکونت رہی۔ کوٹہ قیام کے دوران موصوف کی صلاحیتوں کواور جلا ملی۔ کئی اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان میں 'عالم'، 'لاہور'، 'دلشاد'، 'میرٹھ' اور راجپوتانا گزٹ'' کی ادارت کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

شآد کو خاندان روایت کے مطابق اردو اور فارسی پر قدرت حاصل تھی۔ موصوف شاعری کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے۔ کچھ کوٹہ کی ادبی فضاؤں کا بھی اثر تھا۔ وہ بڑے مخلص انسان اور دوست تھے۔ حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مذہبی تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھے۔ کوٹہ میں ہر دل عزیز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوٹہ بزم ادب کے صدر بنائے گئے۔

سن ۱۹۵۸ء میں ایک بار پھر 'دلشاد' کا پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا۔ جو کم وبیش دو سال تک جاری رہا۔ 'دلشاد' کا سفر شآد صاحب کے انتقال کے ساتھ ختم ہوا۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ آپ تادم آخر زبان وادب کی خدمات کرتے رہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس رسالہ کا شمار معیاری رسالوں میں ہوتا تھا۔ رسالہ 'دلشاد' کے علاوہ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں 'کلام شآد'، پنجہ پنجتن'۔ نالہ دلخراش ۱۹۴۹ء 'جذبات شآد' نعتیہ کلام کا مختصر مجموعہ، مخزن اسرار معرفت ۱۹۴۹ء، عارفانہ کلام کا مجموعہ، حضرت عباس کا مرثیہ جو کہ ۵۵ بندوں پر مشتمل ہے اور اہل بیت کی کامل عقیدت کا ثبوت بھی جو کہ راجستھان میں مرثیہ نگاری کی تاریخ میل کی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں جا بجا انیؔس اور دبیؔر کی تقلید جھلکتی ہے۔ لیکن انیؔس کا رنگ زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

اسی لئے استاد محترم مرحوم ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اپنی کتاب ''راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی خدمات میں لکھتے ہیں:

'اس میں انیؔس و دبیؔر کی پیروی کی انتہائی کوشش کی گئی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔'

شآد کی مرثیہ نگاری میں چاہے واقعہ نگاری ہو، منظر نگاری، جذبات نگاری یا جنگ کا بیان ہر جگہ میر انیؔس کی تقلید نظر آتی ہے۔

چوں کہ شآد کا تعلق علی گڑھ سے تھا۔ شاعری ان کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ علمی اور ادبی محفلوں اور انجمنوں میں شرکت رہتی تھی۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں میں کلام نہیں آپ کا شمار کوٹہ کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ان کے رثائی ادب پر ڈاکٹر نصرت فاطمہ صاحبہ نے مقالہ تحریر کیا ہے اس لئے اس پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی دوسری شعری خدمات پر اس مقالے میں گفتگو کی جائے گی۔

شآد کے کلام میں غزل، منقبت، مرثیہ، سلام اور رباعیات کی تعداد خاصی ہے۔ حمد و نعت اور منقبت میں بھی دلچسپی تھی۔ کہیں

کہیں کلام شاد میں تصوف کے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ انہیں امام حسینؑ سے خاص عقیدت تھی۔ کوٹہ سے جاری ہونے والے رسالہ 'دلشاد' کا حسین نمبر اس کا مبین ثبوت ہے۔

شاؔد نے رباعیات میں بھی اپنے قلم کی جوہر دکھائے ہیں۔ مثال کیلئے یہ رباعی ملاحظہ ہو:

جھلک کوئی نظر آئی نہ ہوتی   تو دنیا یوں تماشائی نہ ہوتی
یہی جیناہے تم پر مر رہا ہوں   جو مر جاتا تو دانائی نہ ہوتی

ان کی نیک نفسی، بے تعصبی اور ذکاوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس طرح کا عارفانہ کلام پیش کیا ہے۔ ان کے رنگ تغزل کی مثال کچھ اس طرح ہے:

عشق جس کا نام ہے وہ بھی ادائے حسن ہے
آپ ہی جلوہ سکھا کر لیا مائل مجھے
غیر کیا جانے کیا راز ہے اس میں پیشہاں
آنکھ سے آنکھ جو محفل میں لڑی جاتی ہے
خاموشی ہے محفل میں اب شمع بھی گھل گھل
کچھ خاک نہیں باقی پر وانوں کی دنیا میں

اس کی علاوہ آپ نے نظمیں بھی لکھیں ہیں مثلاً جب وہ حب الوطنی میں وہ لکھتے ہیں:

ٹیگور کی عظمت نے تیرے گیت سنائے
غالبؔ نے تیرے پیار کے آداب سکھائے
چکبستؔ نے جام ادب سب کو پلائے
اقبالؔ نے جینے کے ہمیں راز بتائے
اللہ نے دی بیخودی میرے خیال میں
وہ سامنے ہے اور مجھے کچھ خبر نہیں

مرثیہ عباس کا ایک بند:

مشکیزہ لیا ہاتھ میں کندھے پر غنم بھی   قبضہ میں بھی رکھی تیغ دو دم بھی
بیتاب ہوئے سبط پیمبر بھی حرم بھی   نصرت نے کیا آپ کے ہمری ہیں ہم بھی

سب مانتے ہیں آپ کو استاد شخاوت
کفّار سے لیجیے آپ داد شجاعت

شاؔد میرٹھی نے کوٹہ آنے کے بعد سرزمین ادب کی جو آبیاری کی اوراس میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے۔نثری مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ان میں سادگی اور سلاست کے ساتھ محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے۔ان کی اس خدمت کے سبب ان کا نام ادبی حلقوں میں ادب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

آزادی کے بعد راجستھان کے اردو شعرا کا اجمالی تعارف

ڈاکٹر ای اے حیدری، اسوسی ایٹ پروفیسر
شعبہ اردو گورنمنٹ لوہیا پی جی کالج چورو

ہندوستان اپنی تہذیبی اور گنگا جمنی روایت کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ یہاں اختلاف رنگ ونسل، قوم ومذہب وملت میں ایک اتحاد واتفاق دکھائی دیتا ہے۔ بیرون ملک سے آنے والوں نے اگر خود کو یہاں کے رنگ میں رنگ لیا تو مقامی افراد نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیرونی افراد کو اس طرح گلے لگایا کہ اپنے اور پرائے کا فرق جاتا رہا۔

اسی اتحاد و یگانگت کی روایت نے خسرو اور رحیم جیسے شاعروں کو پروان چڑھایا جنھوں نے ہندی شاعری کی زلفیں سنواریں تو پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند، برج نارائن چکبست، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی دہلوی، تلوک چند محروم، رگھو پتی سہائے فراق، پنڈت نول کشور شرما، پنڈت آنند نرائن ملا اور آنند موہن گلزار زتشی دہلوی جیسے اردو کے محبوں کو جنم دیا جنھوں سیاست دانوں کی فرقہ وارانہ روش سے الگ اتحاد واتفاق ایسی دنیا تعمیر وتشکیل کی جس میں عشق ومحبت کی وہ منزل دکھائی دیتی ہے جسے میں من تو شدم تو من شدی سے تعبیر کرسکتا ہوں۔

درج بالا تہذیبی روایت کی جیسی روشن مثال راجستھان میں دکھائی دیتی ہے ایسی شاید دوسرے کسی صوبہ میں دیکھنے کو نہ ملے۔ گذشتہ ۲۴ برس میں کم از کم میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔ راجستھانیوں کی جو اپنائیت، فراخ دلی، وسیع القلبی اور مہماں نوازی میں نے دیکھی ہے اس نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔

آزادی کے بعد انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں ہندوستان کی تہذیبی فضا میں علاقائی اور لسانی عصبیت کا زہر گھلنے لگا اور سیاست کے ایک گلیارے سے یہ آوازیں بلند ہوئیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جس نے کم علم اور ناواقف افراد کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اس مسموم فضا سے تحفظ کے لئے یہ ضروری محسوس ہوا کہ ہم اپنی تہذیبی روایت کا از سر نو جائزہ لیں اور اردو کے فروغ میں غیر مسلم شعراء کی خدمات کو پیش کر کے اس فتنہ کا سد باب کریں۔ میں نے اپنے مقالے کو آزادی کے بعد راجستھان کے شاعروں کے مختصر تعارف تک محدود رکھا ہے۔ اس تعارف میں اجمیر، اودے پور، بیکانیر، پالی، ٹونک، جودھ پور، جے پور اور کوٹہ کے شاعروں کی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے

پی پی سریواستو رندؔ: رندؔ ۱۵ ؍جون ۱۹۳۳ء کو اپنے وطن فتح گڑھ ضلع فرخ آباد اتر پردیش میں پیدا ہوئے ۱۹۵۲ء میں والد ہمت بہادر کی اچانک رحلت کے سبب بسلسلہ ملازمت اجمیر آ گئے۔ محکمہ ریل میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے مرکزی سرکار کے

محکمہ ریلوے میں افسر کے عہدے تک پہنچے۔اجمیر قیام کے دوران شاعری کا شوق پیدا ہوا۔علامہ ساغر اجمیری اور انور چغتائی بریلوی سے تلمذ رہا۔

رندؔ نہایت زود گو واقع ہوئے ہیں اب تک ان کے نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ریگ زار ۱۹۶۳ء،رگ سنگ ۱۹۶۹ء،گل رنگ ۱۹۷۴ء،شہر احساس نومبر ۱۹۸۱ء،شجر شجر چھاؤں جون ۱۹۹۲ء،آسماں کے بغیر ۲۰۰۰ء،طنابیں دھوپ کی ۲۰۰۳ء اور جاگتی تنہائیاں ۲۰۰۵ء

رندؔ نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کی محبوب ترین صنف سخن ہے جس میں ان کے کمال کے جوہر نکھر کر سامنے آتے ہیں مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں

تیز بارش جب بجھا دے گی گھنے جنگل کی آگ
ادھ جلے پیڑوں کا لمبا سلسلہ رہ جائے گا

حاکم شہر ہے آسودہ اسے کون پڑھے
فکر آلودہ جبینوں پہ لکھا ہے کیا کیا

قدم بڑھانے کا احساس تو کرو پیدا
جو راستے کے ہیں پتھر وہ ہٹ بھی جاتے ہیں

غم کی دھیمی آگ میں کتنے جہاں جلتے رہے
بے خیالی میں مکینوں کے مکاں جلتے رہے

شہر تو طوفان کی زد میں تھا لیکن رات بھر
ان چراغوں سے تو پوچھو یہ کہاں جلتے رہے

نگل گیا جسے سیلاب اب کی بارش میں
کوئی بتا نہ سکا وہ مکان کس کا تھا

میری بستی میں تو افواہوں نے پر کھولے ہیں
تم جو آتے تو کچھ سنجیدہ فضا لے آتے

پریمؔ بھنڈاری: پریمؔ کا پورا نام پریم سنگھ بھنڈاری ہے ادبی دنیا میں پریمؔ بھنڈاری کے نام سے شہرت پائی۔والد کا نام دلیپ سنگھ بھنڈاری ہے ۲۳ر ستمبر ۱۹۴۹ء کو اودے پور میں پیدا ہوئے۔سکھاڈیا یونیورسٹی سے پہلے موسیقی میں پھر سماجیات میں ایم اے کرنے کے بعد ہندوستانی غزل گائیکی میں پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان میں غزل گائیکی پر ایک کتاب لکھی جو ہندی رسم الخط میں شایع ہوئی۔اس کتاب کی سنگیت کی دنیا میں بڑی پذیرائی ہوئی اس کتاب کا پیش لفظ نوشاد علی نوشاد نے لکھا ہے۔

پریمؔ بھنڈاری کی غزلوں کا مجموعہ جھیل کنارے تنہا چاند ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا،پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جھیل کنارے تنہا چاند جدید اردو غزل کا ایک اہم مجموعہ ہے جسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

اس مجموعے کو پریمؔ بھنڈاری نے اردو ہندی دونوں رسم الخط میں ایک ساتھ شایع کیا ہے۔ان کی غزلیں اس قدر آسان زبان میں ہیں کہ قاری پر ذرا بھی بار نہیں گزرتا۔وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے غزل گائیک بھی ہیں۔سنگیت پر ان کی بڑی گہری نظر ہے،یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مترنم الفاظ کا استعمال بہت عام ہے بطور مثال یہ اشعار دیکھیں۔

اڑ جائیں گے خواب کے پنچھی
کھول کے پلکیں کیوں سوتا ہے

میں جب بھی غزلیں کہتا ہوں
اس کا دکھ میرا ہوتا ہے

دریا ہے اپنے جوش میں کچا گھڑا ہوں میں
اپنے وجود کے لئے پھر بھی لڑا ہوں میں

قسطوں میں کاٹ ڈالیں گے مجھ کو شہر کے لوگ
تنہا لب سڑک جو شجر سا کھڑا ہوں میں

آگ زنی کا آیا ہے الزام مجھی پہ کیوں یارو
ہاتھ جلے ہیں میرے تو بستی کی آگ بجھانے میں

شکوے شکایت پیار محبت سامنے ہوتو اچھا ہے
دیر بہت لگتی ہے یوں بھی خط کے آنے جانے میں

پریم سنگھ: پریم سنگھ خان پور ریاست بھاول پور میں ۲۱ راکتوبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے ان کے والد دیوی دیال ایڈوکیٹ اردو فارسی کے اچھے عالم تھے انہوں نے خود پریؔم کو گلستاں بوستاں پڑھائی آٹھویں کا امتحان گورنمنٹ اسکول خان پور سے، میٹرک صادق ڈین ہائی اسکول بھاول پور سے، ایف اے صادق اجرٹن کالج بھاول پور سے، بی اے خالصہ کالج گجرانوالہ سے بی ٹی گورنمنٹ کالج لاہور سے اور ایم اے کا امتحان راجستھان یونیورسٹی جے پور سے پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں خان پور مڈل اسکول کی ہیڈ ماسٹری چھوڑ کر ایک مہاجر کی حیثیت سے بیکانیر پہنچے، کچھ دنوں کے بعد سادول پبلک اسکول میں ریزیڈنٹ ماسٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے ۱۹۵۱ء میں ہیڈ ماسٹر بن کر ناگور گئے پھر فورٹ اسکول بیکانیر میں ہیڈ ماسٹر بنے اور بعد میں سادول اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے ۱۹۶۰ء میں محکمۂ تعلیم میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوئے ۱۰ رجولائی ۱۹۷۹ء میں وفات پائی

پریؔم سنگھ کا شمار راجستھان کے معتبر ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی زبان صاف ستھری اور سلیس ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین نے ان کی شاعری کا ایک مجموعہ 'بہت دور جانا ہے تجھ کو مسافر' کے عنوان سے ترتیب دے کر دسمبر ۲۰۰۰ء میں طبع کرایا ہے نمونہ کلام درج ذیل ہے

دیکھتے ہی دیکھتے اک شمع جل کر بجھ گئی
پریؔم کی روداد تھی آغاز سے انجام تک

منزل پر پہنچ کر ہی رہے گا وہ مسافر
جو ہو کے پریشاں بھی پریشاں نہیں ہوتا

کیا لب ساحل کھڑا تکتا ہے حیرانی کیساتھ
کود جا طوفاں میں اور کھیل طغیانی کے ساتھ

روشنی سے ہم نہیں محروم رہ سکتے سدا
بڑھ رہا ہے سایۂ تاریکئ باطل تو کیا

یوں تو مضمر ہے اندھیرے میں اجالا لیکن
جس کی پھر رات نہ آئے وہ سحر پیدا کر

یاس کی تاریکیوں میں اک جھلک کی آس پر
منتظر بیٹھے رہے ہم زندگی کی شام تک

حزیں بیکا نیری: حزیںؔ کا نام کامیشور دیال ،ولدیت لالہ شمبھو دیال سہائے ،وطن میرٹھ اور تاریخ پیدائش ۲۳ رفروری ۱۹۱۵ء ہے۔حزیںؔ نے میرٹھ کالج سے ۱۹۳۸ء میں بی ایس سی اور ۱۹۴۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد سادول اسکول بیکانیر میں ٹیچر مقرر ہوئے۔حزیںؔ کو اردو سے نہایت لگاؤ تھا اس لئے دوران ملازمت اردو سے بھی ایم اے کا امتحان پاس کیا۔شاعری کے ذوق وشوق نے حزیںؔ کی پہچان اس دور کے مستند شعراء سے کرادی، بیدلؔ بیکانیری کے کہنے پر شاعری شروع کی اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔حزیںؔ کو انسان کے درد اور عشق کی وسعتوں کا پورا احساس تھا اس لئے ان کی غزلوں میں تڑپ اور گہرائی موجود ہے۔حزیںؔ کا مجموعہ کلام دل حزیں کے نام سے ان کی وفات کے بعد ۱۹۹۴ء میں طبع ہوا چند شعر نمونہ کے طور پر پیش ہیں

اپنا ضمیر بیچ کے خوشیاں خرید لیں ایسے تو اس جہاں کے طلب گار ہم نہیں
عالم ملے، حکیم ملے، فلسفی ملے لیکن یہی تلا ش رہی آدمی ملے
ہم ایک ہی مذہب کی عظمت کے نہیں قائل کعبہ بھی ،کلیسا بھی ،مندر بھی ہمارا ہے

وحشیؔ: پریم شنکر شرما نام،وحشیؔ تخلص،ولدیت پنڈت مان سنگھ،وطن ریواڑی (ہریانہ) ہے۔یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اپنے وطن ریواڑی میں پیدا ہوئے۔میٹرک کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ملازمت سے سبکدوش ہوکر بیکانیر میں مقیم ہوئے اور وہیں ۱۹۹۹ء میں انتقال کیا۔۱۹۴۶ء میں شاعری شروع کی۔انورؔ بھوپالی کے شاگرد تھے۔نمونہ کے طور پر یہ شعر دیکھئے

خدا غارت کرے اس تیرگی کو ترستے ہی رہے ہم روشنی کو
جدھر دیکھو ادھر غارت گری ہے الٰہی ہو گیا کیا آدمی کو

راہیؔ: سریش کمار نام راہیؔ تخلص ہے لیکن اپنے آپ کو سریش راہیؔ لکھتے ہیں۔والد کا نام پنالال ویاس ہے۔۵رستمبر ۱۹۳۷ء کو پالی مارواڑ میں پیدا ہوئے۔تعلیم سے دل چسپی بچپن ہی سے تھی فلسفہ ہندی اور انگریزی کے ساتھ گریجویشن کیا اس کے بعد فزیکل ایجوکیشن میں ڈپلومہ کیا۔ہندی راجستھانی اور اردو میں لکھتے ہیں ان کا شعری مجموعہ آوازوں کے سائے شایع ہو چکا ہے نمونہ کلام درج ذیل ہے

ذکر کیا ہجر کی رات کا جاگتے جاگتے سو گئے
مانا کہ زندگی کا سفر چار دن کا ہے بھاری ہیں چار دن بھی گر ہم سفر نہیں
اب خواب میں بھی ملنا گوارا نہیں اس کو اس واسطے ظالم نے مری نیند اڑادی

چندنؔ ٹونکی: اتم چند نام، چندن تخلص،شجاع آباد ملتان کے معزز زمیندار گھرانے گوگیا کے چودھری رام چند گوگیا کے

یہاں ۱۶؍جنوری ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی۔ جوان ہوتے ہی والد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ۱۹۳۹ء میں والد کے انتقال کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے سر آ گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور تلاش معاش میں در در پھرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں ٹونک (راجستھان) کو جائے سکونت قرار دیا۔ پٹرول کی ایجنسی اور موٹروں کی خرید فروخت کا کام شروع کیا۔

چندنؔ کو دوران تعلیم ہی شاعری کا چسکا لگ گیا تھا، جس پر ٹونک کے ادبی ماحول نے جلا بخشی۔ ان کے کلام میں فن کی نزاکتیں، فکر کی سنجیدگی، مقصدیت، جذبات و کیفیات کی فراوانی اور بیان کی ندرت موجود ہے۔ ان کی شاعری کے چار مجموعے سر چشمہ ۱۹۶۵ء، ہم سفر ۱۹۶۸ء، سپنے اور گلزار چندن ۱۹۸۴ء میں طبع ہو چکے ہیں نمونہ کلام کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں

نہ اپنوں سے کوئی شکوہ نہ غیروں سے شکایت ہے — دلوں میں اور آنکھوں میں محبت ہے مروت ہے
ایثار و مروت نہیں اخلاص نہیں ہے — حیوانوں سے بد تر ہے یہ انسانوں کی دنیا
یا ہم کہیں بھی رسم محبت نہیں رہی — یا رب یہ کیا زمانے کا عالم ہے آج کل
سکھا دوں گا زمانے کو محبت — دیا گر ساتھ میرا زندگی نے
دست وحشت کا کرم اس کے سوا کیا ہوگا — گھر کی دیوار ہی باقی ہے نہ در باقی ہے

پرواز شری دھر: پروازؔ راجستھان کے شہر جودھ پور سے تعلق رکھتے ہیں اردو کے سچے عاشق ہیں۔ قطعہ اور غزل کی صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غزل ان کی سب سے محبوب ترین صنف سخن ہے۔ شعری مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔

مان سنگھ خیال: ڈاکٹر مان سنگھ خیالؔ کے والد کا نام امر سنگھ ہے۔ خیالؔ ۴؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو ہریانہ کے ضلع حصار میں پیدا ہوئے بی ایس سی آنرز ۱۹۶۱ء، ایم اے نفسیات ۱۹۶۷ء اور ایم ایڈ ۱۹۶۹ء میں کیا۔ ۱۹۷۰ء میں جودھ پور یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۸۳ء میں میزورم میں ریڈر ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں پروفیسر کے عہدے پر تقرری پا کر گوہاٹی چلے گئے۔ شاعری کا شوق اوائل عمر سے تھا۔ اب تک چار مجموعے آئینۂ خیال ۱۹۷۲ء، آویزش ۱۹۸۰ء، آئینے خواب میں ۱۹۸۳ء اور تلاش ۲۰۰۱ء میں طبع ہو چکے ہیں۔ پہلا اور تیسرا مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ہے۔ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل اور نظم سے انہیں خصوصی مناسبت ہے چند شعر نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں

لوگ کاندھوں پہ اصولوں کو لئے پھرتے ہیں — ڈھونڈتے ہیں کوئی اچھا سا خریدار ملے
پھر شہر تمنا میں کہیں قتل ہوا ہے — احساس میں مہکی کسی جانباز کی خوشبو
ہم سے تو کسی دل کو دکھایا نہیں جاتا — شاخوں سے پرندوں کو اڑایا نہیں جاتا

سنتے تھے تیرے شہر میں اخلاص بہت ہے ہم سے تو کوئی ہاتھ ملانے نہیں آیا
ڈوبا ہے سارا شہر اندھیرے میں ان دنوں کس کس کے گھر چراغ جلاؤ گے سوچ لو

ہری کرشن خیال: ہری کرشن کے والد کا نام پکھراج ہے وہ یکم مارچ ۱۹۴۷ء کو جودھ پور میں پیدا ہوئے ۱۹۶۲ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۶۶ء میں بی اے کرنے کے بعد بجلی گھر میں ملازم ہو گئے۔ دوران ملازمت انہوں نے ۱۹۷۰ء میں جودھ پور یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ گھر بسانے اور شاعری شروع کرنے کا کام ایک ساتھ ۱۹۶۶ء میں کیا ان کی شاعری کو کسی ایک خانے میں مقید نہیں کیا جا سکتا نمونہ کلام کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کیجئے

تم مجھ سے بے وفائی کرو میں کروں وفا یہ اپنی اپنی دوستو عادت کی بات ہے
میں اکیلا کہاں سفر میں ہوں یاد تیری بھی ساتھ آئی ہے
راہ چلتے ملا تھا کوئی کبھی دوستو بس یہی کہانی ہے

ش ک نظامؔ: شیو کمار نام نظامؔ تخلص ہے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو جودھ پور میں پیدا ہوئے والد کا نام گنیش داس بسّا ہے نظامؔ مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد جودھ پور بجلی گھر میں ملازم ہوئے۔ ان کے پانچ شعری مجموعے لمحوں کی صلیب ۱۹۷۱ء، ناد ۱۹۸۰ء، دشت میں دریا ۱۹۸۴ء، سایہ کوئی لمبا نہ تھا ۱۹۸۸ء اور بیاضیں کھو گئی ہیں ۱۹۹۷ء تک منظر عام پر آ چکے تھے آخر الذکر اور ناد کے علاوہ تمام مجموعے دیوناگری رسم الخط میں طبع ہوئے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہندی ادیب اگیئے کے ناول اپنے اپنے اجنبی کا اردو میں ترجمہ کیا اردو کے نمائندہ شعراء کا ہندی و راجستھانی میں اور راجستھانی و ہندی کے اہم شعراء کا کلام اردو میں ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ مغربی شعراء کے کلام کو بھی اردو زبان میں ترجمہ کر کے نہ صرف اردو کے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے بلکہ اپنی اردو محبت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ جودھ پور سے ایک علمی و ادبی رسالہ بحران بھی جاری کیا تھا۔ نظم، نثری نظم، طویل نظم، غزل، رباعی، قطعہ، دوہے اور چوپائی وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے نمونہ کلام کے طور پر چند شعر دیکھئے

ایک کونپل میں سمٹنے کے لئے پیڑ کا پیڑ بکھرتا جائے
خاموش تھے تم اور مرے ہونٹ بھی تھے بند پھر اتنی دیر کون تھا جو بولتا رہا
کہاں جاتی ہیں بارش کی دعائیں شجر پر ایک بھی پتّا نہیں ہے
پیڑوں کو چھوڑ کر جو اڑے ان کا ذکر کیا پالے ہوئے بھی غیروں کی چھت پر اتر گئے

پریم شنکر شریواستو کے والد کا نام منشی گیا پرشاد ہے پریم شنکر اجین میں ۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے گورنمنٹ کالج اجمیر سے ۱۹۳۸ء میں بی اے کرنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۶۲ء تک

جودھ پور کے جسونت کالج اور ایس ایم کے کالج میں انگریزی کے استاد رہے۔ جودھ پور یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہ اجمیر چلے گئے وہاں سے ڈونگر کالج بیکانیر آئے اور سبکدوش ہوکر جودھ پور میں سکونت اختیار کی۔

شنکر اردو زبان وادب کے سچے عاشق ہیں۔راجستھان اردو اکادمی کے رسالے کا آغاز اور اس کا نام نخلستان آپ کا ہی تجویز کردہ ہے۔قیام لکھنؤ کے زمانے سے شاعری کررہے ہیں۔نمونہ کلام درج ذیل ہے

میں ہوا برباد اپنے شوق سے	آپ پر تو مفت کا الزام ہے
تیرا ہر لمحہ نشاط زندگی	میری ساری زندگی ناکام ہے
آپ کو ہی ہو مبارک حسن کی رعنائیاں	میرا رشتہ ہوگیا ہے درد انسانی کے ساتھ
نہ ہو سکا وہ کبھی تاجدار شعرو سخن	کہ جس کا دل غم انساں سے بے قرار نہیں

عارف لکشمی: عارفؔ لکشمی جوشی کے والد کا نام امردت جوشی ہے وہ ۲۰؍ستمبر ۱۹۶۲ء کو جودھ پور میں پیدا ہوئے ایم کام، آر یدویدرتن اور ایم اے ہندی کے امتحانات پاس کئے۔عارفؔ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور انہوں نے اپنے مطالعے کا تخلیقی استعمال بھی کیا ہے انہیں کئی زبانوں پر مکمل قدرت حاصل ہے۔وہ اورینٹل انشورنس کمپنی جودھ پور میں ملازم ہیں۔شاعری کی عمر کم ہے مگر شہرت ومقبولیت جلد حاصل کرلی ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو

اپنی صورت دیکھ رہا تھا	تیرا چہرہ آئینہ تھا
مسجدوں میں ہو رہی ہو جب اذاں	مندروں میں آرتی اچھی لگے
دوستوں کی دوستی سے آج کل	دشمنوں کی دشمنی اچھی لگے
بولتے چہرے پڑھو گے جب کبھی	تم کہو گے خامشی اچھی لگے

کولؔ جودھ پوری: موہن لال نام، کولؔ تخلص، ولدیت پنڈت پیارے لال اور تاریخ پیدائش ۱۱؍جنوری ۱۹۱۴ء ہے کشمیری برہمن ہیں لیکن پیدا جودھ پور میں ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت پائی۔ابتداء میں بیدلؔ بدایونی سے کلام پر اصلاح لی صاحب دیوان شاعر ہیں۔ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۱۹۴۰ء میں مختصر سا مجموعہ میٹھے بول کے عنوان سے طبع ہوا تھا ۱۹۹۰ء میں راجستھان اردو اکادمی جے پور سے ان کے کلام کا ایک انتخاب آئینہ کے نام سے شایع ہوا تھا۔

کولؔ کی شاعری میں فکر اور جذبے کی ایسی آمیزش ہے جو انھیں ان کے معاصرین سے ممتاز ومنفرد کرتی ہے۔ش ک نظام نے تذکرہ شعرائے جودھ پور میں ان کی ایک غیر مطبوعہ لاجواب مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے۔نمونہ کلام کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ظرف دیکھا نہیں موسیٰ نے طلب کر بیٹھے	اتنا سوچا نہیں توہین بشر ہوتی ہے

بدل رہا ہے زمانہ کچھ ایسی تیزی سے   مرا وجود بھی بیتا ہوا لگے ہے مجھے
نئی تہذیب نے دنیا تو بدل دی لیکن   آدمیّت سے الگ ہو گئے انساں ہو کر
غیرت نے آدمی کو تماشا بنادیا   اب آدمی میں جوہر حسن بشر کہاں

بیتاب جے پوری: بیتابؔ کا پورا نام جے کشن پوری ہے۔ ادبی دنیا میں بیتابؔ جے پوری کے نام سے شہرت پائی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا ۱۹۶۲ء میں ان کا پہلا افسانہ پرچھائیں شایع ہوا، اس کے کافی عرصے کے بعد ۱۹۷۵ء میں ان کی پہلی غزل ماہنامہ جگن احمد آباد میں شایع ہوئی اور پھر غزل کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔

جوہریؔ پرکاش نرائن سکسینہ: جوہریؔ کے والد کا نام منشی سورج نارائن سکسینہ اور تاریخ پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۳۰ء ہے۔ جئے پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت پائی۔ بی اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۶ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ چاند بہاری لال صباؔ سے شرف تلمذ تھا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ سچّے موتی طبع ہو چکا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو

آسمانوں پر نظر دوڑا رہے ہیں اس لئے   جس میں ہو انساں کی بستی وہ ستارہ ہے کہاں
آنسوؤں نے بہہ کے میرے داغ دامن دھودیئے   آج یہ سمجھا ہوں میں گنگا کی دھارا ہے کہاں

سخنؔ جے پوری: کرشن گوپال سکسینہ نام، تخلص سخنؔ، ولدیت منشی جمنا پرشاد، وطن ٹونک اور تاریخ پیدائش ۱۳ اگست ۱۸۹۴ء ہے۔ ان کے والد منشی جمنا پرشاد فارسی کے عالم، ادیب وفاضل تھے سخنؔ نے دربار ہائی اسکول ٹونک سے میٹرک کیا اور مہاراجہ کالج جے پور سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۲۱ء میں بی اے کیا اور ریاست جے پور میں ملازم ہوئے ۱۹۵۱ء میں اسٹیٹ سکریٹری راجستھان سرکار کے عہدے سے پنشن لینے کے بعد دس گیارہ برس تک جے پور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے سکریٹری رہے مستقل سکونت جئے پور میں ہی تھی

سخنؔ جے پوری کے دو مجموعے بہارِ سخن اور کلام سخن کے نام سے طبع ہو چکے ہیں ان کے کلام میں اثر اور روانی موجود ہے خیالات کی گہرائی وپختگی قابل داد ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی   حیران ہوں زمانے کی رفتار دیکھ کر
سمجھ کر بھی جہاں کی بے ثباتی   فریب زیست کھاتا جا رہا ہوں
دیرو حرم کی اصل میں اغراض ایک ہیں   اٹھتا ہی پھر سوال نہیں امتیاز کا
امن و اماں کی دہر میں ہو کس طرح سے خیر   جب بھیڑیا بہ قالب انساں ہے آج کل

تیرے ہی جوش بھرے لفظوں سے آزادی لی — ورنہ کب اس کا تھا امکان زبان اردو
یہ ہی بھارت ہے کہ جو تیری جنم بھومی ہے — تو یہیں پر چڑھی پروان زبان اردو

مجاؔز بھرت پوری: ڈاکٹر پی کے سریواستو نام، مجاز تخلص، ولدیت منشی جواہر لعل سریواستو، تاریخ پیدائش ۲؍فروری ۱۹۳۷ء اور جائے پیدائش بھرت پور ہے۔ ایم اے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد درس وتدریس کو اپنا پیشہ بنایا۔ راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں پروفیسر تھے۔ ۱۹۵٦ء میں ڈاکٹر سریواستو نے شاعری شروع کی۔ ان کی اردو تصانیف میں بازگشت اقبال، مونوگراف مرزا مائل اور چاند بہاری لال صبؔا ہیں، اس کے علاوہ فلسفہ میں ان کی چار کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھئے

کس کے اعزاز میں پھر حشر کا ساماں ہوگا — کس کو دی جائے گی جینے کی سزا میرے بعد
منھ کی کھا جاؤگے رسوائی الگ سے ہوگی — جو کسی اور کو دیوانہ کہا میرے بعد
آ بھی جاؤ کہ رگ جاں سے ٹپکتا ہے لہو — حسن ہو جائے گا محتاج حنا میرے بعد

آزادی کے بعد راجستھان کے اردو شعراء کا جو ذکر میں نے پیش کیا وہ کئی اعتبار سے نامکمل ہے اول یہ کہ اس مقالے میں صرف انہی شعراء کو شامل کیا جن کے شعری مجموعوں کا مجھے علم ہے دوسرے اس لئے بھی نامکمل ہے کہ میرے وسائل محدود ہیں۔ امید ہے کہ نئی نسل اس جانب توجہ دے گی۔ اس نامکمل فہرست کی بنیاد پر بھی سامعین حضرات بہ آسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ راجستھان میں اردو شعر و ادب کے فروغ میں آج بھی گنگا جمنی روایت زندہ ہے اور راجستھان میں اردو تعلیم وتدریس کی جو صورت حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں بقول اقبال ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

☆☆☆☆☆

راجستھان میں اردو ادب کی غالب آواز: دیوان جانی بہاری لال راضی

عابد حسین حیدری
پرنسپل ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج، سنبھل

ہندوستانی ادبیات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جہاں امیر خسرو، رحیم اور ملک محمد جائسی جیسے مسلمانوں نے ہندی زبان کی خدمت کی وہیں پنڈت دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، فراق گورکھپوری اور منشی پریم چند جیسے ہندوؤں نے اردو زبان وادب کے گیسو سنوار کر نہ صرف گنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا بلکہ اپنی نگارشات سے یہ ثابت کیا کہ اردو زبان وادب کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ ہر ہندوستانی سے ہے اور اس زبان کے عاشق صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی ہیں۔ ڈاکٹر ای۔ اے حیدری نے لکھا ہے کہ:

> 'مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی اردو زبان وادب کے فروغ میں حصہ لیا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں نہال چند لاہوری اور بینی نرائن جہاں نے قصہ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا...... دہلی کالج میں ماسٹر رام چندر اور پیارے لال نے اردو نثر کو علمی زبان بنانے کی روش کو فروغ دینے میں کارنمایاں انجام دیئے تو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد لکھ کر لکھنؤ کے زوال آمادہ تہذیب کی مرقع نگاری کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم طرز معاشرت سے اپنی مکمل واقفیت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اردو میں ناول کے فن کو استحکام بخشا۔'
> (آزادی کے بعد اردو شاعری کے ارتقا میں غیر مسلم شعرا کا حصہ: ڈاکٹر ای۔ اے حیدری، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص: ۳۰)

ڈاکٹر ای۔ اے حیدری نے مزید لکھا ہے کہ

> 'پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم لکھ کر شعری محاسن سے اپنی مکمل واقفیت ومہارت کا ثبوت بہم پہنچایا تو پنڈت برج نرائن چکبست نے ہندو دیو مالا اور اساطیر سے اردو زبان وادب کے ذخیرے کو مالا مال کرنے کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا'۔

اردو کے اس گنگا جمنی ادب کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو کا یہ مواد کسی ایک خطے یا علاقے پر منحصر نہیں ہے بلکہ کشمیر سے کنیا کماری اور جنوب سے شمال تک ہر علاقے میں اس کی آبیاری کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے اپنی تحقیق ''راجستھان میں اردو زبان وادب ۱۸۵۷ء تک'' میں علاقۂ راجستھان کی علمی فتوحات

سے کما حقہ واقف کرانے کی کوشش کی ہے اور مختلف ریاستوں اور رجواڑوں سے متعلق شعراء و ادباء پر بھی خاطر خواہ کام کیا ہے۔ موصوف نے مذکورہ کتاب میں 'غیر مسلم شعراو مصنفین بھرت پور' کے تحت غالب کے شاگرد دیوان جانی بہاری لال راضیؔ کا ذکر کیا ہے، جن کی علمیت اور معرکتہ الآرا تصانیف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ راضی کا ذکر منشی جوالا پرشاد (مصنف وقائع ،راجپوتانہ) دیبی پرشاد بشاش جودھپوری (آثار الشعرائے ہنود) خواجہ عشرت لکھنوی (ہندو شعرا)، مالک رام (تلامذۂ غالب)، ویریندر پرشاد سکسینہ (ہماری زبان بابت ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء) اور سلیم جعفر (زمانہ کانپور بابت ستمبر ۱۹۳۷ء، ص: ۱۸۳) نے کیا ہے اور مذکورہ ادبی شخصیات نے راضیؔ کی ادیبانہ شخصیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ شاہد احمد جمالی نے ''خم خانۂ جاوید میں راجستھان کے شعراء'' میں لکھا ہے کہ ''ان کی زود گوئی اور پُرگوئی قابل تعریف تھی۔ اکثر زمینوں میں چوغزلہ کہتے تھے۔ حکام کی تعریف میں قصائد بھی اچھے اچھے کہے ہیں جن سے ان کی قابلیت مسلم ہے۔ اخلاقی مضامین نظم کرنے کا شوق تھا۔'' (خم خانۂ جاوید میں راجستھان کے شعراء: مرتب شاہد احمد جمالی، ناشر راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی جے پور، ص: ۵۹) اس کے علاوہ شاہد احمد جمالی نے اپنی کتاب ''غالب اور راجستھان'' میں راضیؔ کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی معلومات لالہ سری رام، سلیم جعفر، مالک رام اور ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی سے آگے بڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔ انھوں نے مذکورہ محققین اور تذکرہ نویسوں کے علاوہ کالی داس گپتا رضا، عرش ملسیانی اور رام لعل نابھوی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کی تحقیق سوانحی حد تک محدود ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصنیفات کے بارے میں تفصیلی ذکر ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے کیا ہے۔ موصوف کے مطابق راضی کی (۱) گاڈ خدا (۲) دستور تحریری (۳) تصریف، زبان فارسی و انگریزی (۴) دیوان راضی (۵) ارژنگ راضی (۶) نگار راضی (۷) یادگار راضی (۸) دل آرام راضی ان کی نظر سے گزری ہے۔

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی تحقیق کے مطابق 'یادگار راضی' راضیؔ کی پہلی تصنیف ہے لیکن اس کی طباعت ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے ہوئی۔ لیکن اس کے سنہ تالیف کے حوالے سے عثمانی صاحب نے راضیؔ کے قطعہ تاریخ کے آخری دو مصرعوں کو سند قرار دیا ہے جن کے دونوں مصرعوں سے ۱۲۴۷ھ برآمد ہوتا ہے۔

نسبتہً یادگار راضی ہے	قسمتہً یادگار راضی ہے
۱۲۴۷ھ	۱۲۴۷ھ

موصوف نے اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'اس میں صرف لفظ یادگار راضی سے دونوں جگہ سنہ نکالا ہے جو ۱۸۳۶ء سے مطابق ہوتا ہے۔ راضی کا سنہ ولادت ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۵ء کے درمیان بتایا جاتا ہے جو اب تک تحقیق سمجھا گیا ہے۔ اس طرح ۲۱ سے ۲۶ سال کی عمر تک

میں ایسی کتاب مرتب کرنا تعجب خیز ضرور ہے جبکہ اس زمانے میں وہ مدرس تھے۔' (راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ تک، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ص:۱۹۰)

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے لکھا ہے کہ:

'اس سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی معمولی رسالہ قواعد عربی کا مرتب کیا اور پھر اس کو بہت سے اضافوں کے ساتھ ضخیم کتاب میں منتقل کر کے ۱۸۷۸ء میں جب کہ راضی کی عمر ۶۸ یا زیادہ سے زیادہ ۷۳ برس کی ہوگی اس کی طباعت کی نوبت آئی۔' (راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ تک، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ص:۱۹۱-۱۹۰)

یہاں پر ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے یادگار راضی کے تعلق سے ایک غیر جانبدار محقق ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے انھوں نے مزید تحریر کیا کہ ''یادگار راضی سے پہلے کی طبع شدہ تصانیف میں اس کا ذکر نہ ہونا بھی اس دعوے کی دلیل ہے۔'' بہر حال راضی نے مذکورہ تالیف میں عربی قواعد کو نہایت عام فہم و آسان اردو میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب علم صرف سے متعلق ہے۔ راضی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے علم نحو میں بھی ایک کتاب مرتب کی تھی لیکن علم نحو سے متعلق کسی کتاب کا ذکر راجستھانی محققین نے نہیں کیا ہے۔ راضی کا خیال ہے کہ ''عربی زبان کے قواعد ایسے جمع کرنا چاہتا ہوں جو مبتدیوں کو عربی سیکھنا آسان کریں اور منتہیوں کو حل مشکلات میں کام آئیں۔''

یادگار راضی میں راضی نے فہرست ابواب وفصول سے قبل ۸/اشعار پر مشتمل عربی نظم پیش کی ہے اور اس نظم کے ذریعہ عربی زبان وادب اور نحو وصرف پر اپنی گرفت کا ثبوت فراہم کیا ہے، جس کا مطلع ہے:

یَا صَارِفاً ہِمّتَہٗ فِی الطَّلَبْ لِمَا بِہٖ یُعْرَفُ فَنِّ الْأُدب

متذکرہ نظم کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے تا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ راضی کو اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کو نظم کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔

(۱) اے اپنی قوت وہمت کو اس چیز کی جستجو میں صرف کرنے والے جس کی وجہ سے ادب کا فن پہچانا جاتا ہے۔

(۲) اے صاحبان خرد جو کچھ لسان عرب سے اس میں جمع کیا گیا ہے وہ آپ کے لیے کافی ہوگا۔

(۳) اس میں ان علوم کا ذکر کیا گیا ہے جس سے جستجو کرنے والے کامیاب ہوتے ہیں۔

(۴) یہ وہ کتاب ہے جس کا ہر باغ (باب) قابل تعجب ہے جس میں ناظرین کو خوشی وطرب حاصل ہوتا ہے۔

(۵) اس کا پھل پکا ہوا ہے ہر اس شخص کے لیے جو اس پھل کو توڑتا ہے۔

(۶) علم صرف کی تمام باریکیوں کو اس قناعت پسند انتخاب کرنے والے نے جمع کیا ہے۔

(۷) اے طالبان علوم تمہارے لیے مبارکباد، یہ کتاب کامیابی کی کتاب ہے۔
(۸) میں نے اپنی قوت بھر اسے جمع کیا ہے۔ تم سے دعاؤں کا طلب گار ہوں اور میرے حق میں تمہارے اوپر دعا کرنا ضروری اور لازم ہے۔

درج بالا نظم کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راضیؔ کو اپنی اس تصنیف پر بڑا ناز تھا وہ اپنے قارئین سے بہت زیادہ پُر امید نظر آتے ہیں کہ قارئین کتاب اس سے استفادہ کر کے عربی زبان کی قواعد سے کماحقہ واقفیت حاصل کر لیں گے۔

یادگار راضی کے علاوہ دیوان راضی پر مالک رام اور سلیم جعفر نے مثبت رائے پیش کی ہے۔ سلیم جعفر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ مولانا آزاد کی نظم جدید کی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے راضی کی قصیدہ نگاری کے تعلق سے لکھا:

> 'لیکن وہ اصحاب جو پروفیسر آزاد کی طرح اس ابر سیاہ کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں ان کو ضرور داد دینی چاہیے کہ دور اغراق وغلو میں ایک ایاز بردست عالم وفاضل بھی تھا جو شاہراہ عام سے ہٹ کر اور شرائط معقولیت کی پابندی کر کے قصیدہ لکھ سکتا ہے۔' (ماہنامہ زمانہ کانپور، بابت ستمبر ۱۹۳۷ء، ص:۱۵۸)

راضیؔ کے قصائد جہاں اغراق وغلو سے پرے متوازن لب ولہجہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہیں گنگا جمنی تہذیب کی اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے مہاراجہ جسونت سنگھ والی بھرت پور کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی مدح کے اشعار ملاحظہ فرمائیں اور راضیؔ کے حسن نظم کی داد دیں:

نوجوانی میں بھی بفضل خدا   رکھتے ہیں پیروں کی سی عقل رسا
بہتریں رائے دیتے ہیں ایسی   چاہیے دینی وقت پر جیسی
ہوشمندی سخن سے پیدا ہے   ہوشمندوں کی ہوش افزا ہے

مالک رام نے بھی تلامذۂ غالب میں ان کی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> 'نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی اور بسیار نویس وزود نویس تھے...... کچھ مدت راجپوتانہ گزٹ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنی سوانح ''حسب حال'' کے عنوان سے لکھی تھی، لیکن یہ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ سنسکرت صرف ونحو سے متعلق چارلس ولکنسن اور میکس مولر اور مونیر وولیمز کی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے۔'' (تلامذۂ غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص:۱۸۸)

مالک رام نے لکھا ہے کہ ''اخلاقی مضامین سے زیادہ شغف تھا'' غزلوں میں زیادہ تر یہی رنگ نظر آتا ہے لیکن کہیں کہیں مبتذل مضامین بھی در آئے ہیں۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دل بھی دشمن ہوا اس دشمن جاں کی خاطر — ہم جسے سمجھے تھے اپنا، وہ بھی اپنا نہ ہوا
چھپاتی ہے بدی سیرت کی، صورت — مکاں سے عیب چھپتا ہے، مکیں کا
تو چاہ، نہ چاہ مجھ کو، میں تو — جی جان سے تجھ کو چاہتا ہوں
پست ہمت روتے ہیں تقدیر کو — صاحب ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو
برائی سے اچھوں کو ہوتی ہے نفرت — تو اچھا ہے، پھر کیوں ترا دل برا ہے
آرام سے جاہل کی گزرتی ہے ہمیشہ — عاشق کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے

راضیؔ نے جہاں صرف ونحو پر کتابیں مرتب کیں اور عربی وفارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو دیوان مرتب کر کے اہل ادب کے سامنے پیش کیا وہیں انھوں نے اس وقت کی اخلاقی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ راضیؔ کے پیش کردہ مواد کی پرکھ کا ایک پہلو ترجموں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ دنیا کے کلاسیکی ادب کی تخلیق ہر ملک اور زبان کے تقاضوں کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ باخبر مترجم اصلی فضا کی بازیافت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ پھر بھی زبان کا فرق لہجوں کے فرق کی صورت میں بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ مترجم مثنوی ان مشکلات سے کس طرح عہدہ برآ ہوا ہے۔

راضیؔ نے گلستان، بوستاں اور انوار سہیلی کو جس وقت ترجمہ کے مرحلے سے گزار کر مثنوی کا جامہ پہنایا اس وقت ہندوستانی سماج میں بڑی حد تک یکسانیت آچکی تھی۔ سن ستاون کی جنگ آزادی میں ملک کی شکست نے جھنجھوڑا، لیکن کچھ دنوں تو قدغن اور جبر وتشدد کا دور دورہ رہا۔ سکون نایاب تھا، روزگار کم یاب، خاندان کے خاندان ہی نہیں طبقے کے طبقے الٹ گئے تھے اور منتشر و پراگندہ ہوگئے۔ نئی رو اس وقت ابھرنا شروع ہوئی جب نئی تعلیم نے ایک نئے متوسط طبقے کو جنم دیا اور زمینداروں اور رجواڑوں نے ذرا سنبھالا لیا۔ یہ دور بھی شکست وریخت کا دور تھا۔ بہرحال اس دور میں تعمیری ادب کے تنوع پر نظر جانے لگی۔ حالی اور آزاد کی نظم جدید کے شانہ بشانہ ایسا اخلاقی ادب بھی وقوع پذیر ہورہا تھا جس نے فارسی ادب کے سہارے ہماری درسیات میں جگہ حاصل کی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے شاعر وادیب تھے جو فورٹ ولیم کالج سے باضابطہ متعلق تو نہ تھے لیکن سرسید اور غالب کے اس نئے نثری رجحان سے واقف تھے جس کی راہ پکڑ کر اردو ادب میں بیش بہا ذخیرہ جمع ہونے والا تھا۔

دیوان جانی بہاری لال راضی بھی اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی بنا پر غالب اور سرسید کی نئی روکیتحریک کے سپاہی بنے اور اپنے اخلاقی ادب سے فارسی کا وہ ذخیرہ جو درسیات کا مقبول حصہ تھا اسے اردو زبان وادب کا روپ دے دیا۔ انھوں نے اردو کے جینیس شاعر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور دیوان کے ساتھ ساتھ متعدد مثنویاں بھی قلمبند کیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مثنویاں طبع زاد نہیں ہیں بلکہ فارسی کی معرکتہ الآرا تصنیفات کے تراجم ہیں۔ راضیؔ کا ہندوستانی ادبیات کا مطالعہ جہاں وسیع تھا

وہیں عربی وفارسی ادب کا مطالعہ بھی عمیق تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب مثنوی ہندوستان میں فارسی کے ذریعہ آئی تو اس سے قبل ہندوستان میں داستانوں کی ایک بیحد جاندار روایت سنسکرت میں پہلے سے موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان میں ہندیوں اور غیر ہندیوں نے ہندوستان آکر مثنویوں کے انبار لگادیئے جس کا اعتراف علی جواد زیدی نے بھی کیا ہے:

'اس میں کوئی شک نہیں کہ اتباعی اور تقلیدی ہونے کے باوجود ہندوستان میں لکھی جانے والی مثنویوں کا وسیع ذخیرہ بڑی ادبی اہمیت کا حامل ہے۔'

(مثنوی نگاری، علی جواد زیدی، نشاط پریس ٹانڈہ، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۷)

راضیؔ نے اتباعی اور تقلیدی انداز کی مثنوی اخلاقیات کی درسی کتابوں گلستان سعدی، بوستان سعدی اور انوار سہیلی ملا حسین واعظ کاشفی کو ترجمے کی شکل میں پیش کی جس کا ذکر علی جواد زیدی نے مثنوی نگاری میں بھی کیا ہے:

'نگار راضی کے نام سے گلستاں، دل آرام راضی کے نام سے بوستاں اور ارژنگ راضی کے نام سے انور سہیلی کے ترجمے کیے۔ ان کے سالہائے تصنیف علی الترتیب ۱۲۸۶ھ، ۱۲۸۷ھ اور ۱۲۸۹ھ ہیں۔ انوار سہیلی کے ترجمے کو منظوم ہونے کا ذکر برقؔ (شیام سندر لال سیتاپوری مصنف بہارِ سخن) نے بھی کیا ہے۔ سب ترجمے بہت شگفتہ اور اصل سے قریب ہیں۔ مثلاً نگار راضی میں سعدیؔ کے اس شعر کا ترجمہ کہ:

چنان قحط افتاد اندر دمشق که یاران فراموش کردند عشق

یوں کیا ہے:

قحط ایسا دمشق میں آیا فرق یاروں کے عشق میں آیا

(مثنوی نگاری، علی جواد زیدی، ص: ۲۶۴)

نگار راضی کے تعلق سے یادگار راضی کے صفحہ ۲۸ پر ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی وشمالی نے مقام نینی تال سے ۱۵ ستمبر ۱۸۶۹ء کو لکھا ہے کہ:

''جس دماغ سوزی سے آپ نے گلستاں کو اردو نظم کیا ہے قابل تحسین ہے۔'' اسی طرح ۷ اگست ۱۸۷۲ء کی چٹھی میں ڈائریکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ'' آپ کی کتاب دل آرام راضی کی رسید شکریہ کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ حضور نواب لفٹنٹ گورنر صاحب کی رائے میں آپ نے اس کتاب فارسی کا ترجمہ ہوشیاری سے کیا ہے اور آپ کی کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔''

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے نگار راضی کے ترجمے کو رواں اور شستہ قرار دیا ہے۔ نگار راضی تاریخی نام ہے، جس سے ۱۸۷۳ء برآمد ہوتے ہیں۔

دل آرام راضی، شیخ سعدی کی مشہور کتاب بوستاں کا منظوم ترجمہ ہے جو ۱۲۸۷ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔ ابتدا اس طرح ہے۔ گویا راضیؔ اسلامی تہذیب سے راضی ہو کر حمد کر رہے ہوں:

کیا کروں حمد خالق گیہاں عقل ہے اس کی حمد میں حیراں
دیکھتا ہے وہ ظاہر وباطن ایک ہے اس کو رات ہو یا دن
اپنی قدرت سے آپ ہے قادر اپنی ندرت سے آپ ہے نادر
پہلے پیدا کیے عناصر چار مختلف خاک و باد و آب ونار

اللہ کے وجود اور اس کے ثبوت کے گواہ درج ذیل اشعار ہیں جو رواں اور شستہ بھی ہیں:

ہے عیاں ہر کہیں نہاں جیسا ہے نہاں ہر کہیں عیاں جیسا
کچھ نہیں اس کے نور سے خالی چاہیے چشم دیکھنے والی
گہہ بناتا ہے گہہ بگاڑتا ہے گہہ بساتا ہے گہہ اجاڑتا ہے
واحد و لاشریک و لاثانی اور فانی ہیں وہ ہے لافانی

درج بالا اشعار راضیؔ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کے شعرا و مصنفین کی زبان مشترکہ تہذیب کی زبان تھی۔ ہندو اس طرح شعر نظم کرتے تھے گویا وہ مسلمان ہوں اور مسلمان ہندو عقائد کے کرداروں کا اس طرح احترام کرتے تھے گویا وہ ان کے عقیدت مند ہوں۔ معبود کے اوصاف، حمد خدا و نعت رسول کا انداز نظم راضیؔ کو اس مشترکہ تہذیب کا نمائندہ بنا دیتی ہے جس کے لیے ہندوستان تمام عالم میں ممتاز و ممیّز ہے۔ اسی طرح ارژنگ راضی میں راضیؔ نے انوار سہیلی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ طلبا کے لیے مفید ہو۔ آسان اور عام فہم زبان میں یہ ترجمہ اصل سے قریب محسوس ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ انوار سہیلی کلیلہ و دمنہ کا دوسرا روپ ہے کلیلہ و دمنہ کے ماخذ اور اس کے مصنف کے بارے میں اکثر تاریخ نگاروں کے یہاں اختلاف رائے نظر آتا ہے لیکن سنسکرت ادبیات کے مورخین اور فارسی و عربی ادبیات کے دانشوران یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کلیلہ و دمنہ کا اصل ماخذ سنسکرت کی کتاب 'پنچ تنتر' ہی ہے۔ اس کتاب کی بنیاد نصیحت آمیز اخلاقی باتوں پر رکھی گئی ہے۔ کلیلہ و دمنہ یوں تو دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوئی لیکن ایرانیوں نے اس کتاب سے خصوصی دلچسپی دکھائی ہے۔ متعدد شعرا و ادبا نے اس کے ترجمے کیے لیکن ملا کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشمی کے ترجمہ انوار سہیلی کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انوار سہیلی چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور اسے ہندوستان میں بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور تعلیمی نصاب میں بھی شامل کیا گیا اس کے نثری ترجمے بستان حکمت مترجمہ حسام الدولہ فقیر محمد خاں گویا کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ انوار سہیلی کی مقبولیت کے سبب راضی نے اس کا ترجمہ ارژنگ راضی کے نام سے مثنوی کی ہیئت میں

کیا۔سبب ترجمہ میں لکھتے ہیں:

ہیں مترجم تمام فارسی سے صاف ہر دم دوام آرسی سے
مشتہر ہیں یہ بیدپا کے طفیل معتبر ہیں یہ بھید پا کے سہیل
لائقوں کے لیے ہیں نورنظر شائقوں کے لیے ہیں سوزجگر
عیب پوشوں کو ہے عطا سے کار عیب جویوں کو ہے خطا سے پیار
جو خطا پر خطا دکھاتے ہیں سو خطا پر عطادکھاتے ہیں
راضیاؔ خدمت عوام ہے یہ باضیا قسمت دوام ہے یہ

حمد کا یہ شعر:

ہے کلام اس کا برتری کا تمام ہے تمام اس کا برتری کا کلام

ارژنگ راضی کا تاریخی نام ''بہارکلک راضیؔ'' ہے،جس سے ۱۲۸۹ء برآمد ہوتا ہے۔ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے لکھا ہے کہ ''ترجمہ بڑی توجہ اورکوشش سے کیا ہے۔''بطورنمونہ چنداشعار ملاحظہ فرمائیں:

جب سنا سنگ پشت نے یہ تمام تب اسی مہر سے کیا یہ کلام
تجھ سا مہماں جہاں پہ آتا ہے لطف یزداں وہاں پہ آتا ہے
نہ سعادت ہے کوئی ہم مقدار تیری صحبت کے فیض سے زنہار
اور ایسی خوشی ہے اور کہاں جیسی تیری محبت سے ہے عیاں
تیری شمع جمال پر مفتوں جیسے لیلیٰ کے حال پر مجنوں
تیرے خورشید رخ پہ ذرہ وار جاں نثاری سوا نہیں کچھ کار

درج بالا اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بڑے سلیقے سے ترجمہ کیا ہے۔نیز نگارراضیؔ،دل آرام راضیؔ اور ارژنگ راضیؔ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیرمعمولی صلاحیت کے حامل تھےاوران کا نام راجستھان کے ادباءوشعراء ہی میں نہیں بلکہ ہندوستانی ادبیات کے شعراوادبامیں صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہےاور بقول راضی چونکہ ان کا کام خدمت عوام ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ راجستھان میں اردوادب کی غالب آواز ہیں۔

☆☆☆☆☆

شانتابالی۔بحیثیت افسانہ نگار

ڈاکٹر اسما مسعود
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو
گورنمنٹ ڈونگر کالج بیکانیر

راجستھان ایک تاریخ ساز خطہ ہے۔یہ علاقہ جس قدر اپنی بہادری اور تیغ زنی کے کارناموں کے لئے مقبول ہے، اتنا ہی سرزمینِ راجستھان اپنے شعری اور ادبی کارناموں کے لحاظ سے بھی زرخیز ہے۔ ہمارا موضوع راجستھان کے غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں کے کارہائے نمایاں پر گفتگو کرنا ہے۔تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے اُردو ہندو مسلم اتحاد کی سب سے عظیم الشان نظیر ہے۔اُردو کی روح سکیولر ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اس کی بنیاد میں ہر تہذیب اور ہر فرقے کی خدمات پوشیدہ ہیں۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس زبان نے ایک مشترکہ تہذیب کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔اس لئے اُردو کو ایک فرقے یا ایک مذہب کی زبان مت کہیئے ۔راجستھان میں اردو شعروادب کی تاریخ کو جب ہم اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کئی ایسے غیر مسلم حضرات کے نام ہمارے سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے اس علاقے کے شعروادب کی آبیاری میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔فکشن کی جب ہم بات کرتے ہیں تو شیونارائن سکسینہ،بشمبر پرشاد سکسینہ، لالہ کیول کشن، کامیشور دیال حزیں، پریم شنکر سری واستو،سدرشن بالی، اور شانتا بالی کے نام خاصے مقبول ہوئے۔ہم یہاں شانتا بالی کے افسانوں کی روشنی میں انکی افسانہ نگاری پر گفتگو کرنا چاہیں گے۔

شانتابالی ۱۵؍دسمبر ۱۹۲۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئیں، ان کے والد کا نام دیوی دیال دتاّ ہے۔وہ پولس محکمے میں نوکری کرتے تھے۔ والد کی پولس محکمے میں ملازمت کی وجہ سے شانتابالی کو لاہور، ملتان، دلّی، الہ آباد وغیرہ مختلف مقامات پر رہنے کا موقع ملا، انہوں نے نیشنل کالج گجراں والا سے بی اے اور ہندی آنرس الہ آباد سے کیا ا۔اردو ہندی کے افسانہ نگار سُدرشن بالی سے ان کی شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی، اور ۱۹۶۲ء سے وہ جے پور میں قیام پذیر ہیں۔

شانتابالی کی ادبی زندگی کا آغاز غزل سے ہوا، ان کا اولین افسانہ بی بی سنتو ۱۹۵۸ء میں ہندی میگزین مایا میں شائع ہوا۔اردو میں اس کے دو سال بعد ۱۹۶۰ء سے '۲۰ ویں صدی' (دلی) سے ان کی اُردو افسانہ نگاری کا آغاز ہوا، شمع، تحریک، ۲۰ ویں صدی، آجکل، مایا اور منوہر کہانیاں کے علاوہ 'نخلستان' میں بھی ان کے افسانے اُردو ہندی رسم الخط میں شائع ہوئے لیکن اب تک کوئی افسانوی مجموعہ سامنے نہیں آیا، ریڈیو سے بھی شانتابالی کے کافی افسانے Broad Cast ہوئے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کے راجستھان کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی صف میں شانتابالی اپنے فکر وفن کی پختگی کی وجہ سے جانی جاتی

ہیں۔ان کے ہم عصروں میں مختارالرحمٰن راہی،سدرشن بالی،ممتاز شکیب،ستار جے پوری اور مہندی ٹونکی وغیرہ اہم ہیں۔

۲۰۱۰ء میں راجستھان کی افسانہ نگاری پر کام کے دوران مجھے شانتابالی سے ملاقات کا موقع ملا،یہ ملاقات ۲۷ مئی ۲۰۱۱ء کو انکے دولت خانے پر ہوئی،اس انٹرویو کے دوران ہمارے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

'ایک اچھے افسانہ نگار کو کہانی لکھنے کا فن آنا ضروری ہے۔کہانیاں تو ہر انسان میں چھپی ہوتی ہیں ہمارے آس پاس بے شمار کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔لیکن جب تک ہم انہیں ایک خاص فنّی سلیقے کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نہیں اتارتے وہ دل میں نہیں اترتیں اور فن کا تقاضہ بھی پورا نہیں ہوتا' ۔۲

شانتابالی کے افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہانی کہنے کے فن سے واقف ہیں اور اپنے کرداروں کی بخیا اُدھیڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔انہوں نے معاشی معاشرتی ناہمواریوں اور تہذیبی مسائل اور قدیم قدروں کے ذوال پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی ہے۔جس میں پلاٹ کی چستی،کہانی پن اور کردار کی نفسیات پر بھرپور گرفت واضح ہے انکے کچھ افسانوں کے ذریعہ ہم شانتابالی کی افسانہ نگاری سے متعلق گفتگو کریں گے۔

نخلستان،میں جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔انکا افسانہ'ہَون' کافی مشہور ہوا تھا،یہ ایک ایسی لڑکی شیلاؔ کی کہانی ہے جس کی ماں اپنی بیٹی کے لئے خوب سے خوب تر رشتے کی تلاش میں شیلاؔ والد کے لائے ہر رشتے کو ٹھکراتی گئی۔پورے افسانے پر ایک حزنیہ تأثر حاوی ہے۔والد کا انتقال ہوگیا،ماں گھر کی رونق کے لئے پہلے بیٹے کی شادی کردیتی ہے لیکن بہو نے آکر شوہر کے ساتھ الگ گھر بسا لیا،ماں بیٹی اکیلے رہ گئے،ماں کی اندھی محبت اسے خودغرض بنا دیتی ہے اپنے دل کی تسلی کے لئے وہ چاولوں کا ایک ڈرم الگ اٹھا کر رکھ دیتی ہے کہ یہ شیلاؔ کی بارات کی دعوت کے لئے ہیں۔وقت اپنی رفتار سے گزرتا گیا شیلاؔ کی ماں کا بھی انتقال ہوگیا،افسانے کا حزنیہ تاثر اس وقت اپنے شباب پر ہوتا ہے جب اس چاول کے ڈرم میں سے جو شیلا کی بارات کی دعوت کے لئے تھے،ان میں سے ایک کٹوری چاول شیلا کی ماں کی تیرہویں کے ہَون میں ڈالنے کے لئے منگائے جاتے ہیں۔ہَون کُنڈ میں ان چاولوں کے ساتھ شیلا کی تمام اُمیدیں بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔شیلا افسانے کا مرکزی کردار ہے جس کی کردار سازی میں افسانہ نگار نے محنت سے کام لیا ہے۔اس کی ماں کی اندھی محبت اس کی ڈولی نہیں اٹھنے دیتی،شیلا اور اس کی والدہ دونوں کی نفسیاتی کیفیت افسانے میں بخوبی ابھرتی ہے۔افسانے کے اختتام پر شیلا کی ذہنی کیفیت ملاحظہ ہو

'وہ دل ہی دل میں سوچتی ہے ماں نے یہ کبھی کیوں نہیں سوچا کہ میں چاول نہیں ہوں جو زیادہ پرانا ہونے پر خوبصورت ہوجاؤں یہ تنہائی کا دُکھ مجھے کالے کیڑے کی طرح کھائے جا رہا ہے' ۔۳

ممتاز شکیب صاحب نے راجستھان کے افسانہ نگاروں اور ان کی تخلیقات کا ایک مجموعہ''مٹی کی خوشبو'' کے عنوان سے ۱۹۸۹ء

میں پیش کیا تھا۔اس مجموعے کے مقدمے میں صفحہ نمبر ۱۱ پر ممتاز شکیب نے گذشتہ تین دہائیوں میں راجستھان کے افسانہ نگاروں میں شانتابالی کا ذکر کرتے ہوئے ان کا ایک افسانہ ''جذبات کا رشتہ،، بھی اپنے مجموعے میں شامل کیا ہے۔شانتابالی کا افسانہ ''جذبات کا رشتہ'' زندگی کا المیہ ہے۔ یہ سردار بلونت سنگھ اور اس کی بیوی امرت کور کی کہانی ہے۔شانتابالی زندگی کی کھردری حقیقتوں کو بڑی خوبصورتی سے قصہ کی شکل میں ڈھال دیتی ہیں،واقعات کا ایک بہاؤ ہے جو آپ کو تھمنے نہیں دیتا،قصہ پن ہے کوئی جھول نہیں شروع سے آخر تک افسانہ ہمارا دامن پکڑے رہتا ہے۔بلونت سنگھ کے پڑوس میں مہرا صاحب اور ان کی بیوی نئے نئے رہنے کے لئے آتے ہیں ایک دو دن بعد بلونت خود ہی امرت کور کے ساتھ مہرا صاحب کے گھر ملنے چلے جاتے ہیں۔بلونت جتنا خوش مزاج تھا امرت کور اتنا ہی سنجیدہ اور خاموش۔

امرت کور کی خاموشی اور درد کا راز اس وقت کھلتا ہے جب اس کے گھر ہونے والے اکھنڈ پاٹھ میں مسٹر مہرا اور مسز مہرا نے امرت کور کو سفید لباس اجڑی مانگ اور اجڑی کلائیوں کے ساتھ بلونت کی تصویر پر ہار چڑھا دیکھ کر اس کا سبب دریافت کیا،جبکہ بلونت تو ابھی زندہ تھا۔اس نے بتایا کہ امرت کور کی شادی بلونت کے جڑواں ہم شکل بھائی سکھونت سے ہوئی تھی جو بارات کے گھر سے لوٹتے وقت ایکسی ڈینٹ میں مارا گیا،لیکن بلونت کے والد نے امرت کور کو بیوہ کا لباس پہنانے کے بجائے بلونت سے اس کی شادی کر دی، بظاہر امرت کور کو زندگی کی خوشیاں دیدی گئیں لیکن وہ ایک عورت تھی اور اپنے محبوب شوہر سے جذبات کے رشتے کو کبھی فراموش نہیں کر سکی۔شانتابالی اپنے افسانوں کے لئے اپنے گردوپیش سے کہانیاں اٹھاتی ہیں۔انکا افسانہ خوشبو انسانی نفسیات پر بھرپور اثر ڈالتا ہے یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے مرے ہوئے شوہر کی یاد کو اس کے استعمال کئے ہوئے کپڑوں میں تلاش کرتی ہے۔ان کپڑوں میں اس کے شوہر کی خوشبو موجود تھی،لیکن اچانک اس کی زندگی میں پیش آنے والا ایک واقعہ اسے یہ سبق دے جاتا ہے کہ اب تک اپنے شوہر کی خوشبو اور اسکی یاد کو وہ اس کے استعمال کئے ہوئے کپڑوں میں تلاش کر رہی تھی اور ان کپڑوں کے چلے جانے سے دکھ کے گہرے ساغر میں اتر گئی تھی،جبکہ شوہر کی خوشبو اور اس کی سب سے بڑی یاد تو اس کے بیٹے کے روپ میں اس کے سامنے موجود تھی۔

شانتا بالی کے افسانوں میں ان کے نسوانی کرداروں کی نفسیات بھرپور طریقے سے اجاگر ہوتی ہے۔وہ عورت کے جذبات،اس کی خوشیاں،اس کے دکھ اور اس کے وجود کے مسائل کو شدت سے اٹھاتی ہیں۔تانیثیت کے علاوہ سماجی اور تہذیبی زندگی کی ناہمواریوں، نئی نسل کی بے راہ روی اور تہذیبی قدروں کے زوال،فسادات اور نفرت کی سیاست پر بھی ان کا قلم ہمیں متوجہ کرتا ہے۔تانیثیت کے موضوع پر ''خوشبو'' ایک اچھا افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی صاحبہ نے اپنی کتاب 'تنقید و جستجو' کے صفحہ نمبر ۹۱ پر شانتابالی سے متعلق لکھا ہے کہ

'مسز شانتا بالی آج بھی اس فن کو بلندیوں تک پہنچانے میں کوشاں ہیں۔ان کی شخصیت کی طرح ان کے افسانے بھی باوقار ہوتے ہیں، اگر میں یہ کہوں کہ قومی یکجہتی ان کے اکثر افسانوں کا موضوع ہے تو غلط نہ ہوگا لیکن واعظانہ انداز میں یہ اس نازک موضوع کو نہیں چھیڑتی ہیں بلکہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں وہ اس حقیقت کو تلاش کر کے سادگی سے پیش کر دیتی ہیں' ۴

ہندو مسلم اتحاد اور موجودہ دور کی نفرت کی سیاست پر شانتا بالی کے دو افسانوں کا ذکر ہم یہاں کرنا چاہیں گے 'طوفان کے بعد' اور 'سسکتے ناسور' فسادات کے موضوع پر طوفان کے بعد ایک کچی بستی کی کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے پسماندہ طبقے کے افراد کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں فساد کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ بستی کے لوگوں میں نماز اور آرتی کے لئے جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں لیکن سارے Differences تب ختم ہو جاتے ہیں جب وجود کی بقا کا مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور ایک سیلاب میں ساری بستی ڈوب جاتی ہے۔ سب کا گھر اور اسباب تباہ ہو جاتے ہیں، ایسے میں ایک ہندو عورت کو کھانا کھلانے کے لئے ایک مسلم عورت اپنی پلیٹ میں دلیا لاتی ہے تو پنڈت سکھرام کہتے ہیں کہ

'رضیہ بہن لے آؤ اسی میں، دھرم کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس پلیٹ میں کھانے سے نشٹ ہو جائے گا' ۵

افسانے کی بنیادی صفت انسان کا نیکی اور اچھائی پر بھروسہ ہے اور یہی افسانے کی خوبی ہے، پنڈت سکھرام کا مکالمہ ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا ۱۹۸۱ء کی یہ کہانی آج کے دور کے ساتھ Relevant نہیں ہے؟

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء کے نخلستان میں شانتا بالی کا افسانہ 'سسکتے ناسور' شائع ہوا۔ یہ افسانہ نفرت کی سیاست کے درمیان مذہبی یگانگت کی شمع روشن کرتا ہے۔ یہ پاکستان سے ہندوستان آئی ایک ہندو عورت کی کہانی ہے، جسکا جسم تو ہندوستان آ گیا لیکن روح اور دل ابھی بھی پاکستان میں ہیں۔

آج کی مکروہ سیاست نے دونوں ملکوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی ہے۔ کہانی کی راوی اس محبت، خلوص اور یگانگت کو یاد کرتی ہے جو وہ پاکستان میں ہی چھوڑ آئی ہے۔ جنگ کے دوران وہ ریڈیو پر کان لگائے خبریں صرف اس لئے سنتی ہے کہ اس کی دوست کے بیٹے کی کوئی خبر مل جائے جو یہاں جنگی قیدی کے روپ میں جیل میں ہے۔

شانتا بالی کہتی ہیں کہ میرے اکثر افسانے میرے اپنے تجربے ہیں 'سسکتے ناسور' میں بھی میری اور میری پاکستانی دوست فہمیدہ کی داستان ہے۔ جس کا بیٹا سعید Army میں تھا۔ ہم نے محبت کے وہ دن دیکھے تھے میری دیوالی کا جوڑا فہمیدہ کی ماں اور فہمیدہ کی عید کا جوڑا میری ماں تیار کرتی تھیں۔ لیکن آج کی مکروہ سیاست کے نفرت بھرے کھیل سے دل دکھتا ہے جس نے ووٹ کی خاطر انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا، اگر ہم انسانیت کی بقا چاہتے ہیں تو اپنے دلوں میں دوسرے کو جگہ دینی ہی ہوگی۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شانتا بآلی زندگی سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ایسی افسانہ نگار ہیں جو اپنے تجربوں اور گردو پیش کے ماحول سے کہانیاں اٹھا کر افسانے کا روپ دے دیتی ہیں ان افسانوں کی فنّی پختگی ہمیں اپیل کرتی ہے۔شاعری میں شانتا بآلی کا تخلص روشن ہے۔نفرت اور ظلم کے خلاف انہوں نے لکھا ہے۔

جانے کیا سوچ کے سب لوگ یہ چپ بیٹھے ہیں — میں بھی خاموش رہوں یہ مجھے منظور نہیں
اور ہونگے جو ستم کو بھی کرم کہتے ہیں — میں تیرے ظلم سہوں یہ مجھے منظور نہیں
نام روشن ہے میرا گردشِ دوراں سن لے — میں اندھیروں میں رہوں یہ مجھے منظور نہیں

حوالے

(۱) شانتا بآلی کے ساتھ ایک انٹرویو بمقام دولت خانہ شانتا بالی ۸۲/۸۴ مان سرو ور جے پور، تاریخ، ۲۷رمئی ۲۰۱۱ء

(۲) ایضاً

(۳) نخلستان سہ ماہی راجستھان اُردو کادمی جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء صفحہ ۹۶

(۴) ''تنقید و جستجو'' ڈاکٹر روشن اختر کاظمی صفحہ ۹۷ راجستھان اردو اکادمی ۱۹۸۷ء

(۵) ''پہلی آواز'' مرتبہ۔ممتاز شکیب۔۱۹۸۷ء راجستھان اردو اکادمی جے پور

☆☆☆☆☆

فارسی اور انسان دوستی کی روایت

پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اگر ہم پوری دنیا کے ادب کا جائزہ لیں اور عالمی شاہ کاروں کی ایک فہرست مرتب کریں اور یہ جائزہ پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ لیا جائے۔ کسی طرح کے تعصب اور جانب داری کو راہ نہ دی جائے۔ فارسی کے ادبی شاہ کار اپنی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے زیادہ ہوں گے۔ آپ اس فہرست سے شاہنامۂ فردوسی، گلستان سعدی، رباعیات خیام، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کو خارج نہیں کر سکتے۔ عالمی ادب میں فارسی شاہپاروں اور شاہ کاروں کو یہ مقام ان کی انسان دوستی اور انسانیت و عالمی نقطۂ نظر کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر پی ڈبلیو اوبری نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'دنیا کی تہذیب وتمدن میں ایران کا حصہ' میں لکھا ہے کہ 'چین کو چھوڑ کر دنیا کا کوئی دوسرا ملک ثقافت اور کلچر میں اتنی توانائی اور شان دار تاریخ نہیں رکھتا جتنا کہ ایران'

ایران اپنے جغرافیائی محل ووقوع کے اعتبار سے مشرق ومغرب کے سرراہ واقع ہے یہ کلچر وثقافت کے لین دین میں اپنا حصہ بطور بیچ والے کے رکھ کر ایک دوسرے کو پہنچا تا رہا ہے۔ ایرانیوں میں نسلی اعتبار سے آریاؤں کی وہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دوسری جگہ کے آریاؤں میں موجود ہیں یعنی اپنے کلچر کو ٹوٹ کر چاہنا۔ اپنی ثقافت کو مشخص رکھنا اور جب اس ثقافت پر کوئی آنچ آئے تو کچھوے کی طرح اپنی گردن اور پاؤں سکیڑ کر خطرے کو گذر جانے دینا۔ ساتویں صدی میں عرب حملہ کے نتیجہ میں زرتشی مذہب کے ماننے والے ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں کی کثیر آبادی میں انھوں نے اپنی سماجی حیثیت کو اونچا کیا لیکن ثقافتی اعتبار سے اپنی نسلی خصوصیات کو باقی رکھا۔ ایران میں بقیہ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن دو تین صدیوں کے لوٹ پھیر میں ہی فارسی ثقافت اور کلچر پھر ابھر کر اوپر آ گیا۔ فارسی عالم اسلام کی تسلیم شدہ ثقافتی زبان بن گئی اور آج جو کچھ دنیا کو اسلامی کلچر نظر آتا ہے وہ ستر فی صدی فارسی یا ایرانی ہے یا ایرانیوں کی دین ہے اس سلسلے میں پروفیسر آلدومیلی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے

The Principal frost of Arab Sience of the orient is a creation of Persia with out any possible contestotion, in fact, it is to persia that belongs to the best names of these greatest savents such as Razi an avicena an Al Birun,

فارسی زبان وادب میں انسانیت اور بشر دوستی کا واضح تصور قدیم زمانے سے اس لئے موجود رہا ہے کہ ایک تو آریائی نسل سے ایرانیوں کا تعلق آریاؤں کا مرکزی ایشیا سے دوسرے ملکوں میں ہجرت اور پھیلاؤ بہت سی دوسری قوموں سے ان کا تعلق ٹکراؤ یا

دوستی کی شکل میں

(ب) فارس یا ایران کا جغرافیائی محل وقوع بہت سی قوموں سے واسطہ اور رابطہ

(ج) ایران میں اسلام سے قبل بہت سے مذاہب کا ظہور جیسے مانویت، مزوکیت، مترائیت اور زرتشتیت ان مذہبی اختلافات اور انتشاشات کے باوجود ایک ایسا فلسفۂ زندگی جو سب کے لئے قابل قبول ہو وہ ڈالا گیا۔

پندار نیک، گفتار نیک،، کردار نیک

(Good thought,speech & deed)

(د) فلسفہ اور علم و دانش سے محبت، یہ امتیاز دنیا میں شاید ایران کو ہی حاصل ہے کہ اس کے ہر گاؤں، قصبہ یا شہر سے کم از کم ایک اہل علم ایک دانشور، صاحب نظر، مؤرخ، شاعر ضرور پیدا ہوا ہے۔ آپ ایران کے نقشہ پر نظر ڈال کر کسی ایک مقام پر انگلی رکھیں اور پھر ۔۔۔ دائرۃ المعارف اسلامی میں اس سے منسوب کسی ایک نام کو تلاش کیجئے۔ آپ کو زیادہ زحمت نہیں ہوگی بلکہ بعض مردم خیز خطوں میں تو آپ کو اس شہر سے نسبت رکھنے والے بہت سارے مل جائیں گے۔

(ہ) مذہب اسلام کی تعلیمات: یوں مذاہب کی فہرست میں اسلام چاہے سب سے اوپر نہ ہو اور اس کی عمر کئی ہزار سال دوسرے مذاہب کے مقابلے میں نہ ہو لیکن وحدانیت اور آفاقیت کا واضح تصور، انسانیت کی وحدت اور مساوات پر سختی سے عمل درآمد، اس پورے تصور کا اثر فارسی زبان والوں پر بہت ہی مثبت ہوا۔

(و) تصوف، عرفان اور روحانیت کی ترویج و اشاعت میں ایران کی خصوصی دلچسپی و توجہ جس کے نتیجے میں تزکیہ نفس اور صفائی کردار پر زیادہ زور بمقابلہ بعض ظاہری عبادات کے یا دکھاوے کی رسموں کے۔

(ز) اخلاقی تعلیم۔ فلسفہ اور تصوف کے مطالعہ و دلچسپی کی وجہ سے فارسی والوں نے ایسی تعلیمات کو اپنایا اور ان کو بڑھاوا دیا جو مختلف مذاہب کے ماننے والے اور نہ ماننے والوں کے لئے قابل قبول ہوں۔

ان تعلیمات اور اصولوں کے پیش نظر انسان کو تمام سرگرمیوں کا مرکز تسلیم کر لیا گیا۔ انسان کی خلاقی صلاحیت اور غور و فکر کی استعداد کی بناء پر خلیفہ فی الارض، جانشین و نائب خدا، مظہر قدرت و نمائندہ فطرت مان لیا گیا۔ صوفیا نے تو اس کو عالم اصغر قرار دیا۔

اس عالم اصغر کی ترتیب و تزئین اور تربیت صرف اس شکل میں ممکن ہے کہ اس کی بدیوں، برائیوں، کوتاہیوں، کمیوں اور قصوروں کو نظر انداز کیا جائے اور اس کی خوبیوں، اچھائیوں، بھلائیوں، نیکیوں اور صفتوں کو ابھارا جائے۔

دقیقی زرتشتی مذہب کا ماننے والا کہا جاتا ہے۔ ایران کی مسلم سوسائٹی میں اتنی لچک ہے کہ وہ اس کے انتخاب کی داد دیتی ہے اور اس سے مذہب کی بنیاد پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی کہ یہ معاملہ اس کا اور اس کے خدا کے درمیان ہے۔

دقیقی چار خصلت برگزیدست
بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ
می خون رنگ و کیش زر دشتی

رزمیہ کا بادشاہ فردوسی شاہنامہ میں اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر کرتا ہے۔ان کے مذہب، ثقافت، تاریخ، عقائد، زبان اور تہذیب کا دفاع کرتا ہے بلکہ اپنی تہذیب پر فخر کے ساتھ دوسروں پر حملہ کرنے سے باز نہیں آتا۔مذہب کے نام یا علاقہ پر لڑنا انتہائی مضحکہ خیز سمجھتا ہے۔

خداوند ما و شما خود یکیست
بہ یزدان ما، ہیچ پیکار نیست
گذشتہ ازو، قبلہ ما بت است
چہ در چین و کابل چہ در ہند بست

ہر انسان کو عقیدہ و مذہب کی آزادی دی جائے وہ اپنی صواب دید اور عقل سے اپنا دین انتخاب کرے۔اس میں اکراہ اور جبر کو کیا دخل۔

ابوسعید ابوالخیر جو صوفی شاعر ہیں ان کا کہنا ہے:

راہ تو بہر قدم کہ پویند خوش است
وصل تو بہر سبب کہ جویند خوش است
روی تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست
نام تو بہر زبان گویند خوش است

عمر خیام نے تو خدا کو کھلم کھلا چیلنج کیا ہے، کہ یہ دنیا تیری نہیں بلکہ ہماری ہے۔اور اب یہ ہماری مرضی ہے کہ اس کو جس قیمت پر بھی چاہیں بیچ ڈالیں

مائیم خریدار مہ کہنہ و نو وانگاہ فروشند عالم بہ دوجو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت می پیش من آرد ہر کجا خواہی رو

یا ان دو مشہور رباعیوں میں خدا سے جو مکالمہ بلکہ شکوہ کیا ہے ان کے انداز اور اگر تیور دیکھیں تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے خدا سے نہیں بلکہ

کسی برابر والے کو مخاطب کر رہا ہے۔

ابریق می مرا شکستی ربی
بر من در عیش را بہ بستی ربی
بخاک فگندی می گلگوں مرا
خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

اب ذیل کی رباعی شرمندگی اور ندامت لیکن برابری کے احساسات کے ساتھ دیکھئے

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
وآں کس کہ گناہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

فارسی کا شاعر دنیا میں عدم مساوات، ظلم و جور، بادشاہوں اور جابروں کا استبداد، علمائے ظاہر پرست اور زاہدان ریا کار کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ اس سب کے لئے آسمان اور خدا کو کوستے ہیں۔ انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔ زاہد خشک، محتسب، عالم جاہ پرست اور اہل شریعت کا مذاق اڑایا جاتا ہے لیکن فارسی زبان اور فارسی کے ماحول نے ان کو برداشت کرنے والا بنا دیا تھا۔ اس بنیاد پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ بظاہر غیر اسلامی اصطلاحات جیسے شراب، ساقی، پیر مغاں، مئے کش، میکدہ، خرابات، رند، بادہ فروش، معشوق، مغبچہ کو خوب برتا گیا بلکہ ان کے معانی میں وسعت پیدا کر کے مجازی سے حقیقی تک پہنچا دیا گیا۔ آپ انسانوں کی کوئی بھی انجمن بنائیں گے تو کیا اس کے صدر دروازے پر سعدی کے یہ اشعار جو انسانیت کے لئے ایک اعلان آزادی اور مساوات کے مانند ہیں نہیں لکھوائیں گے

بنی آدم اعضای یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوی بدرو آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

شراب اسلام میں حرام قرار دی گئی ہے۔فارسی شاعری کا خاصا حصہ شراب کی تعریف میں بھرا ہوا ہے۔گاندھیائی اثرات کے تحت ہمارے ملک میں بھی ہفتہ کے دن کچھ اعلان کر دیئے گئے ہیں،لیکن سب جانتے ہیں کہ طلب صادق رکھنے والوں کو پچھلے دروازوں سے مل جاتی ہے۔ذرا نظامی گنجوی اس صورت حال سے دوچار ہیں۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود
می زدم نالہ و فریاد، و کس از من نشود
یا نہ بد ہیچ کس از بادہ فروشان بیدار
یا کہ من ہیچ کس ام ہیچ کسم در نکشود
پای از شب بگذشت بیشترک یا کمتر
رندی از غرفہ برون کرد سرورخ بنمود
گفت خبر است دریں وقت کرامی خواہی
بی محل آمدنت بردر ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو، ہرزہ مگو
کاندریں وقت کسی بہر کسی در نکسود
این نہ مسجد بہر لحظہ درش بکشایند
کہ تو دیر آیی و اندر صف پیش استی زود
دین خرابات مغان است درو رندان اند
شاہد و شمع و شراب و شکر و نامی و سرود
ہر چہ در جملۂ آفاق درین جا حاضر
مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی
خاک پامی ہمہ شو تاکہ بیا بی مقصود

آپ نے دیکھا کہ مولانا نظامی گنجوی نے کچھ بننے کا نسخہ یہ بتایا ہے کہ سب کی خاک پا بن جائیں اور اس میں مسلمان یا برہمن یا گبر و کی قید نہیں۔

کسی کا دل دکھانا ہی تمام فساد کی جڑ ہے۔ بظاہر بہت معمولی سانسخہ ہے کہ کسی کا دل نہ دکھایا جائے لیکن بہت ہی مشکل کام ہے۔ سعدی جو واقعی انسانیت نواز شاعر ہیں انہوں نے 'دل توڑنے' کو ہنر نہیں مانا۔ اس میں کیا کمال ہے کہ کسی کا دل توڑ دیا جائے

نا توانی دلی بدست آور
دل شکستی ہنر نمی باشد

خواجہ حافظ نے تو اس کا مقام اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اس کو اصل شریعت قرار دیا ہے۔

دلی را میآزار ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہی نیست

خواجہ عبداللہ انصاری نے تو دل جیتنے کو ہی سب سے بڑی کرامت قرار دیا ہے۔ عام طور پر مریدین اپنے مرشدوں اور پیروں سے خارق العادت کرامات منسوب کرتے ہیں۔ وہ ان سب کی تحقیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر در ہوا پری مگسی
بر دی دریا روی خسی
دلی بدست آور تا شود کسی

اگر آپ ہوا میں اڑنے لگیں تو یہ کام تو مکھی بھی کرتی ہے۔ اگر آپ پانی کے اوپر چلتے ہیں تو اس میں کیا کمال ہے۔ تنکا پانی پر تیرتا ہے۔ ذرا دل ہاتھ میں لو تا کہ تم کچھ بن سکو۔

تعصب و تنگ دلی و تنگ نظری سے فرقہ پرستی ابھرتی ہے، یہ انسانیت کو تقسیم کرتی ہے لوگ اپنے اپنے فرقہ اور مسلک کے بارے میں کوتاہ نظری کی وجہ سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں:

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ذرا دونوں آنکھوں میں توافق نہ ہو تو آدمی کو دنیا بٹی بٹی نظر آتی ہے ہم لوگ اسی بھینگے پن کی وجہ سے دنیا کو بانٹ دیتے ہیں جب کہ قصور اپنا ہے۔

یگانہ بودند و یکتا شدن ز چشم آموز
کہ ہر دو چشم جدا و جدا نمی نگرند

زندگی کی بنیاد مہر و وفا ہی ہو سکتی ہے اس میں دنیا کے سب ہی لوگ شریک ہیں وہ مذہب، رنگ، نسل، قوم یا ملک کی بنیاد پر

تقسیم نہیں ہوسکتی یہ جذبہ تو سبھی انسانوں میں ہے۔

ما قصہ سکندر و دارا را نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

زندگی کو آرام سے گذارنے کے لئے صرف ایک نسخہ ہے کہ دوست دشمن سے اچھا سلوک کیا جائے

آسایش دو گیتی تفسیر ایک دو حرف است

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اس کی دنیا کو مشرق ومغرب میں تقسیم یا ملکوں کی سرحدوں میں محدود کر کے اس کے بندوں کو داخلہ سے روکنا سراسر ناانصافی ہے

مرد خدا بہ مشرق و مغرب غریب نیست

ہر جا کہ می رود ہمہ ملک خدای اوست

مختلف زمانے میں خدا کی نشانیوں میں سے ہیں ان میں کوئی کمتر یا بہتر نہیں ہے اور اگر ایک زبان کے بولنے والوں میں بھی اختلاف ہوتو اس زبان کے اتحاد سے کیا فائدہ جس میں دل نہ ملے ہوں

ہمدلی از ہم زبانی بہتر است

ایک صوفی ،ایک فارسی شاعر اپنے انداز فکر اور روایت کی موجودگی میں مذہبی اختلافات اور دینی تضادات میں بھی ہم آہنگی اور اتفاق دیکھتا ہے۔خواجہ نظام الدین اولیاء کو:

’ہر قوم راست راہے دین وقبلہ گاہے‘

اس اختلاف کے ساتھ جینے کا راستہ دکھاتے ہیں یا بعد کے ایک شاعر کو اس پر تعجب ہوتا ہے

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دین چرا است

از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

ہماری زندگی میں دکھاوا اور ریاکاری اتنی زیادہ ہے کہ دین و مذہب بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔کاش ہم ایسی زندگی گزاریں کہ ہمارے اعمال پر مسلمان اور ہندو دونوں ہی فخر کریں نہ یہ کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمیں اپنانے سے گریز کریں۔

چناں با نیک و بد عرفی بسر کن پس مردن

مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسو زاند

ہیومنزم کا یہ تصور یوروپ میں بہت قدیم نہیں ہے۔ وہاں اس تصور کو پہنچے ہوئے کوئی چار صدیاں گزری ہیں البتہ پروپیگنڈا اور نت نئے وسائل کے تحت ایسا لگتا ہے جیسے آدم سے تا ایندم یوروپ کی قومیں اس کی امین و وارث رہی ہیں ۔صرف غریب اور پس ماندہ مشرق ہی پیچھے رہ گیا ہے حالاں کہ اس طرح کے نظریات نے مشرق سے مغرب کی طرف سفر کیا ہے۔ یہ یہاں کی قدیم روایت رہی ہے۔ فارسی کا مزاج تو شروع سے ہی عالمی'انسانی' آفاقی رہا ہے۔اس کے دانشوروں نے اپنی اخلاقی تعلیم اور فلسفۂ فکر سے انسانوں کی ازلی خوبیوں اور حسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ۔فارسی زبان وادب کی یہ روایت جب ہندوستان کی سرزمین میں اردو زبان کو متاثر کرتی ہے تو غالبؔ یہی بات اپنے پراثر اور رسا انداز میں کہتا ہے

وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یا یہ خیال کہ:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں تو اجزائے ایماں ہو گئیں

انسانیت کے لئے مایوسی اور قنوطیت تباہ کن ہوسکتی ہے۔انسانیت کو ہمیشہ مختلف چیلنجوں کا سامنا رہا ہے اور انسان آسمان پر کمندیں ڈالتا رہا ہے،نئی دنیائیں تلاش کرتا رہا ہے اور نئی دنیاؤں کی بنیاد بھی ڈالتا رہا،غم اور ملال اس کے پائے استقلال کو ہلا نہیں سکے ہیں

بیا تا گل بر افشانیم و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

ہمارے یہاں کی تاریخ اور دوسری درسی کتابوں کے ذریعہ سے نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے حالاں کہ ہماری تاریخ آمیزش و آویزش واقعات پر ہے۔ہم صرف بادشاہوں کی آویزش کے واقعات کو لے کر تاریخ کو جنگ نامہ بنا دیتے ہیں۔حالاں کہ انہی میں قوموں کی آمیزش کے واقعات بھی ہیں۔

اگر کم علمی اور تعصب کی یہی صورت رہی تو پھر انسان کی تلاش فضول ہے انسانیت تو انسانوں کے دم سے ان کے سہارے اور صرف انہی کے لئے ہے ورنہ یہ جہاں حیوانوں کا گھر یا چڑیا گھر بن کر رہ جائے گا۔

مولانا روم آٹھ صدی قبل ایک انسان کی تلاش میں نکلے تھے:

وی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کہ از داد و دو ملولم و انسانم آرزوست

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

☆☆☆☆☆